خصوصی مطالعہ

حیدر قریشی

تخلیقی ادب میں کسی نئی یا غیر معروف صنف کو رائج کرا دینا اپنے آپ میں اتنی بڑی بات ہے کہ اسے تاریخ ہمیشہ ایک ادبی واقعے کے طور پر یاد رکھتی ہے۔ 'آزاد غزل' کو متعارف کرانے کے لئے جتنا مظہر امام کو یاد رکھا جائے گا، شائد اس سے کہیں زیادہ 'ماہیے' کو پھر سے رواج اور قبولیت دلانے کے لئے حیدر قریشی کی یاد آئے گی۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ پچھلے کئی عشروں سے جرمنی میں خاموشی، مگر نہایت سرگرمی سے ادب کی تخلیق و ترویج میں مصروف یہ فنکار صرف ماہیے ہی نہیں لکھ رہا ہے بلکہ اس نے غزل، نظم، افسانے، انشائیے، خاکے اور سفر نامے لکھنے اور تنقید و تحقیق کے شعبے میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ ایسے قلم کار کی ادبی قدر و قیمت اور تخلیقی جہات کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے اور قریب سے دیکھا اور دکھایا جائے۔

حیدر قریشی: فن اور شخصیت: ایک نظر میں

نام : قریشی غلام حیدر ارشد
قلمی نام : حیدر قریشی
پیدائش : 13 جنوری 1952
جائے پیدائش : ربوہ، ضلع جھنگ
والد : قریشی غلام سرور صاحب
کچھ اہم : 1968ء میں دسویں کا امتحان پاس کرتے ہی اپنے شہر خانپور کی شوگر مل میں ملازمت کر لی۔ انیس سال اس شوگر مل میں مزدوری کر کے گزارے، اسی دوران پرائیویٹ طور پر اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ 1970ء سے 1974ء تک انٹر میڈیٹ، گریجوایشن اور ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔ اسی دوران شادی بھی ہوئی
تعلیم : ایم اے اردو
آغازِ شاعری : 1971ء میں پہلی غزل کہی جو 1972ء میں ثاقب زیروی کے ہفت روزہ لاہور میں شائع ہوئی۔
شادی : 1971ء ہی میں شادی ہوئی تھی، اور پہلی غزل شادی کے بعد کہی تھی۔ اولاد میں پانچ بچے ہیں، دو بیٹیاں، تین بیٹے سب شادی شدہ ہیں اور ابھی تک تین نواسے، دو پوتے اور تین پوتیاں ہو چکی ہیں۔ پوری فیملی جرمنی میں سیٹ ہو چکی ہے۔

تصانیف (شعری) :
۱۔ **سلگتے خواب** (غزلیں) 1991ء
۲۔ **عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے) 1996ء
۳۔ **محبت کے پھول** (ماہیے) 1996ء
۴۔ **دعائے دل** (غزلیں اور نظمیں) 1997ء
۵۔ **غزلیں، نظمیں، ماہیے** (چاروں مجموعے) 1998ء
۶۔ **دردِ سمندر** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے۔) یہ مجموعہ الگ سے شائع نہیں ہوا کلیات **"عمرِ لاحاصل کا حاصل"** میں شامل کیا گیا ہے۔ 2005ء

تصانیف (نثری) :
۱۔ **روشنی کی بشارت** (افسانے) 1992ء
۲۔ **قصے کہانیاں** (افسانے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا بلکہ کتاب **افسانے** میں دونوں افسانوی مجموعے ایک جلد میں شائع کیے گئے۔ 1999ء
۳۔ **ایٹمی جنگ** (افسانے اردو، ہندی ایک ساتھ) 1999ء
۴۔ **میں انتظار کرتا ہوں** (افسانے ہندی ورشن) 1996ء
۵۔ **میری محبتیں** (خاکے) 1996ء اور 1998ء
۶۔ **کھٹی میٹھی یادیں** (یادیں) یہ کتاب الگ سے نہیں چھاپی **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں شامل ہے۔ 2005ء
۷۔ **سوئے حجاز** (سفرنامہ، عمرہ کا احوال) 2000ء
سوئے حجاز (حج کی روداد کے اضافہ کے ساتھ) 2004ء
۸۔ **فاصلے قربتیں** (انشائیے) یہ کتاب الگ سے شائع نہیں ہوئی، **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں شامل ہے۔ 2005ء
۹۔ **عمرِ لاحاصل کا حاصل** (پانچ شعری مجموعے اور چھ نثری مجموعے ایک جلد میں۔ عوامی ایڈیشن) 2005ء

تحقیق وتنقید :
۱۔ **اردو میں ماہیا نگاری** (یک موضوعی) 1997ء
۲۔ **اردو ماہیے کی تحریک** (مضامین) 1999ء
۳۔ **اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما** (مضامین) 1999
۴۔ **وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت** (مضامین) 1995ء
۵۔ **حاصلِ مطالعہ** (مضامین کا مجموعہ) 2008ء

انٹرنیٹ کالم :
۱۔ **منظر اور پس منظر** 2004ء
۲۔ **خبرنامہ** 2006ء
۳۔ **ادھر اُدھر سے** 2008ء

رابطہ : Rossertstr.6, Okriftel
65795 Hattersheim,
Germany.
فون : 0049-6190-930078
ای میل : hqg786@arcor.de
ویب سائٹ : www.haiderqureshi.com
www.jadeedadab.com

اتنا سب کچھ ایک ساتھ

فیصل عظیم (امریکہ)

پرواز پہ پابندی
سارے پرندوں کی
آواز پہ پابندی

پوچھے کوئی بگلوں سے
سرخ ہوئے دریا
جب عشق کے پگلوں سے

ماہیے کو زندہ رکھنا تو خیر ایک ''فرضِ منصبی'' جیسی اصطلاح معلوم ہوتی ہے اور ایک تخلیق کار کا خون جب لفظوں کی رگوں میں دوڑ کر انہیں ماہیا' غزل' نظم' افسانہ یا کسی اور صورت میں زندگی دے یا یوں کہیے کہ اس کے چہرے پر اپنے رنگ بکھرا جائے تو صنف کی حفاظت پر بات کر کر کے ہم دراصل تخلیق اور تخلیق کار دونوں کی روحوں کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ ماہیے کو ''پروان چڑھانے'' کے حوالے سے حیدرقریشی صاحب کا ذکر بارہا ہوا ہے اور ہوتا رہے گا مگر اہم بات ان کا کلام ہے جو اس صنف میں بھی اتنا ہی توانا اور تازہ ہے جتنا غزل اور نظم میں' ورنہ غور کیجیے تو لوگ صنف سے جڑ کر تخلیق کی خوبصورتی اور گہرائی کے بجائے سطحی عوامل' مثلاً ہندی/ فارسی لغت یا لہجے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور تخلیق کے بجائے صنف کی خدمت کے حوالے سے پہچانے جانے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ ایک مستند' نابغۂ روزگار ادیب کی یہی سب سے بڑی پہچان ہے کہ وہ ان ''تجاوزات'' کے پیچھے چھپ نہیں جاتا اور حیدرقریشی صاحب کی زبردست تخلیقی صلاحیت اس بات کا ثبوت ہے۔ میں نے ان کے بارے میں سب سے پہلے انشائیے پر انور سدید صاحب کی کتاب (نام بھول رہا ہوں) میں پڑھا اور یوں میں شروع میں ان سے نثر نگاری کے حوالے سے متعارف ہوا۔ خوش قسمتی یہ کہ وہ اپنے آج اور آنے والے کل سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں لہٰذا جرمنی میں بیٹھ کر بھی انٹرنیٹ کے ذریعے ہم ان سے رابطے میں رہتے ہیں' سو اس وسیلے سے مجھے بھی ان کی شاعری اور نثر دونوں تک رسائی حاصل کرنا اور بھی آسان ہو گیا۔

رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

میں اوروں کی طرح حیدر صاحب کے فن کا تو قائل ہوں ہی مگر ان کی شخصیت کی ہمہ جہتی اور ان کے ادبی کاموں کی مقدار اور معیار کے توازن پر حیران بھی ہوں۔ یہ سارا کام تخلیق کے ساتھ ساتھ اتنے تسلسل سے جاری رکھنا دل گردے کا کام ہے اور ہمارے لئے ایک قابلِ تقلید مثال بھی۔

حیدرقریشی صاحب کی نظمیں موتی کی لڑیوں کی طرح لفظوں کو پروئے ہوئے ہوتی ہیں۔ میں نے ان کی جو آزاد نظمیں پڑھی ہیں وہ اپنے صوتی تاثر میں پابند نظموں کا لطف بھی رکھتی ہیں اور آزاد نظموں کی عملی شکل بھی اور فکری رفتار بھی۔ ان کے ہاں غزلوں اور نظموں میں جہاں آج کا سچ اور عملی زندگی کی تصویریں ہیں' وہیں روایت کے رنگ اور استعارے بھی جا بجا نظر آتے ہیں جو ان کی ادبی وابستگی کا شعوری یا فطری نتیجہ ہیں اور اس جدیدیت کے ساتھ اگر یہ روایت نہ ہوتی تو شاید ان کی جدیدیت کی بنیادیں بھی شاید اتنی مضبوط نہ ہوتیں۔

حیدرقریشی صاحب کی نثر کے کئی پہلو ہیں' مجھے ذاتی طور پر ان کے کالم بہت پسند ہیں کیونکہ حالاتِ حاضرہ' معاشرے اور خود اپنی شکست و ریخت اور اس پر پوری توانائی سے گفتگو اور سوچ بچار ان کی طرح میرا بھی موضوع ہے جبکہ وہ قدروں کے پیغمبر بھی ہیں اور عامل بھی۔ ان کے انشائیے محض لایعنی اشیا کو ادب میں خوبصورتی سے جگہ دینے اور یوں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو منوانے پر ختم نہیں ہوتے بلکہ ان سے متعلق معاشرے کے اصل مسائل اور موضوعات انشائیوں میں حلول کیے ہوتے ہیں جن پر مضمون یا مزاح لکھنا آسان ہوتا ہے مگر انشائیہ لکھنا اور اس ''غیر ہضم شدہ'' صنف میں اپنا پیغام پہنچا دینا آسان نہیں ہوتا۔ ان کے انشائیوں کی یہ خوبی قابلِ ستائش ہے اور ان میں چھپا خفیف تبسم انشائیے کا تحفۂ خاص۔

حیدر صاحب کے افسانے ان کی شاعری کی طرح بولتے ہوئے ہوتے ہیں۔سوالوں سے بھرپور' جواب دیے بغیر نتیجے تک پہنچانے والے اور راستہ بتانے والے افسانے۔علامت ان کے ہاں بہت جاندار ہوتی ہے اور آپ کو کسی بے معنی تجرید سے بچائے رکھتی ہے۔ان کے افسانے وہی ہیں جو میرے آپ کے گرد بکھرے ہوئے ہیں مگر ان کے قلم سے وہ کوئی اور رنگ اور کوئی اور روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے مجھے سوچنا پڑ رہا ہے کہ میں یہ سب کچھ ''ایک'' ادیب کے بارے میں لکھ رہا ہوں یا کئی ادبا کے بارے میں مگر پھر یہ میرے لئے ایک اور قابلِ تقلید مثال بن جاتی ہے اور سوچتا رہ جاتا ہوں کہ اتنا کچھ ایک ساتھ آخر کیسے!

انٹرویو

گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، انڈیا میں اردو کے استاد
عبدالرب استاد کے سوال اور حیدر قریشی کے جواب

سوال: آپ کی پہلی شعری تخلیق کونسی تھی؟اور کہاں شائع ہوئی؟

جواب: میری پہلی تخلیق ایک غزل تھی، ۱۹۷۱ء میں یہ غزل کہی تھی۔ ؎

عقل نے جتنا مری راہ کو ہموار کیا
اتنا ہی میرے جنوں نے اسے دشوار کیا

یہ غزل ثاقب زیروی کے رسالہ ویکلی لاہور میں ۱۹۷۲ء کے وسط کے کسی شمارہ میں چھپی تھی۔تاہم میرے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب ''انٹرویوز'' کے صفحہ ۲۷ پر اس کا ذکر موجود ہے۔''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' کے صفحہ نمبر ۲۰۳ اور ۲۰۴ پر بھی اس کی تفصیل درج ہے۔

سوال: پہلا افسانہ کونسا تھا؟

جواب: اوراق لاہور کے خاص نمبر (اوراق کے پینتیس سال)، شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۰ء کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر میرے پہلے افسانے کی اشاعت کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ شمارہ وہاں کسی طرح حاصل کریں۔مزے کی کہانی درج ہے۔اوراق کا مذکورہ اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں:

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۷۹ء کے آخری شمارہ کے ذریعے میری'اوراق' میں انٹری ہوئی تھی۔میری غزل اوراق میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔غزل کا مطلع تھا:

اک یاد کا منظر سا خلاؤں پہ لکھا تھا
جب ٹوٹتے تاروں سے کوئی جھانک رہا تھا

پھر میرے نام سے میرا پہلا افسانہ 'ماما''اوراق کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔یوں یہ میرا پہلا افسانہ ہوا،لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' لکھ چکا تھا اور یہ افسانہ ''جدید ادب'' خانپور کے ۱۹۷۸ء کے کسی شمارہ میں اپنی بیوی (مبارکہ شوکت) کے نام سے چھاپ چکا تھا۔تب رشید امجد اور بعض دیگر جدید افسانہ نگاروں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا کہ یہ مبارکہ شوکت کون ہیں؟،تو مجھے اپنے افسانہ لکھنے پر اعتماد سا ہونے لگا۔چنانچہ میں نے افسانہ ''ماما'' تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کو بھیجا۔ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ وہ افسانہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی دیکھ لیا اور وہ افسانہ میرے نام سے چھپنے والا میرا پہلا افسانہ ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہو گیا'' (تاثرات بعنوان ''اوراق اور میں''مطبوعہ اوراق لاہور ،پینتیس سالہ نمبر شمارہ جنوری، فروری ۲۰۰۰ء)

اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ میرے سب سے پہلے لکھے گئے افسانہ ''اندھی روشنی'' کو معیار دہلی کے پاکستانی افسانہ نگار نمبر (نیا پاکستانی افسانہ، نئے دستخط مطبوعہ ۱۹۸۲) میں میرے نام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا جو اپنی ابتدائی عمر میں میرے لئے بڑی کامیابی تھی۔

سوال: شروع میں کن شاعروں اور افسانہ نگاروں سے متاثر رہے ہیں؟

جواب: یوں تو میں ابتدائی عمر میں جن اچھے، بُرے شاعروں اور مصنفوں کو پڑھتا رہا ہوں ان سب سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا ہوں۔بعد میں بھی جس کی بھی کوئی اچھی تخلیق پڑھی، اس سے متاثر ہوا ہوں۔اس کے لئے نامور اور غیر معروف تخلیق کاروں کی تخصیص نہیں ہے۔جدید شاعری میں مجھے اس عہد کے وزیر آغا کی نظم نے بطور خاص متاثر کیا۔افسانہ نگاروں میں جوگندر پال اور رشید امجد کے نام پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ان دونوں سے ابتدا سے ہی متاثر رہا ہوں۔

سوال: جرمنی کی طرف ہجرت کی غرض وغایت؟

جواب: کسی شاعر کا ایک شعر ہے

اذاں پہ قید نہیں، بندشِ نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں

لیکن اس شعر کے برعکس میرے پاس ہجرت کے ایسے بہت سارے جواز تھے، اس کے باوجود وطنِ عزیز کو چھوڑتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا:

کعبۂ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدرؔ
تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

سوال: جدید ادب کے دورِاول کے کتنے شمارے چھپے؟، دوئم کے کتنے اور اب تک سوئم کے کتنے شمارے اور نمبر وغیرہ چھپ چکے ہیں؟

جواب: جدید ادب کے دورِاول کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا اور آخری شمارہ غالباً ۱۹۸۶ یا ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ خاص نمبر دو ہی چھپے۔ ایک جوگندر پال نمبر اور دوسرا سات ادیب نمبر جس میں سات ادیبوں کے گوشے ایک ساتھ دیئے گئے تھے۔ دورِ دوئم میں صرف دو شمارے نکال سکا۔ ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں دو شمارے۔ دراصل پرچے پر میری مدیرانہ گرفت نہیں تھی۔ جس دوست کو میٹر بھیج دیا اس نے آگے اپنی مرضی کا بہت کچھ شامل کر لیا۔ موجودہ دور میں بحیثیت مدیر تو میں پوری طرح رسالہ کو دیکھ رہا ہوں۔ تاہم بعض انتظامی امور میں ابھی بھی مجھے کچھ الجھنیں درپیش ہیں اور میں ان الجھنوں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تاہم مدیر کی حیثیت سے رسالے کی ہر سطر پر میری نگاہ ہوتی ہے اور ساری سیٹنگ میں خود کرتا ہوں۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے مجھے یہ سہولت حاصل ہو سکی ہے۔

سوال: منزہ یاسمین کے مقالہ میں لکھا ہے کہ آپ کی پانچ بہنیں ہیں مگر ماہیے بعنوان 'چند رشتے' میں آپ نے چار بہنوں کا ذکر کیا ہے؟ (اور یہ 'ماں جائے' کیا ہے؟)

جواب: اصل بات یہ ہے کہ بچپن میں ایک بہن شمسہ قمر پانچ، چھ سال کی عمر میں ۱۹۶۸ء میں فوت ہو گئی تھی۔ اس لئے منزہ والے مقالہ میں تو پانچوں بہنوں کا ذکر آ گیا لیکن ماہیوں میں صرف زندہ بہنوں کا ذکر ہوا ہے۔ سال ۲۰۰۶ء میں سب سے چھوٹی بہن فہمیدہ کوثر بھی چالیس سال کی عمر میں فوت ہو گئی ہے۔ اب تو تین بہنیں رہ گئی ہیں۔

پنجابی میں ایک ہی ماں سے پیدا ہونے والے بھائی، بہنوں کے لئے ماں جایا اور ماں جائی بولا جاتا ہے۔ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کے صفحہ نمبر ۲۷ پر ایک غزل'' آپی کے لئے'' ہے۔ (روایتی محبوب والی غزل، شاید پہلی بار بہن کے رشتہ کے لئے بھی کہی گئی ہے) اس میں بھی ماں جائی کے الفاظ موجود ہیں۔ صفحہ نمبر ۳۹ پر نظم درد کے اختتام میں درددوں کو بھی ماں جائے کہا گیا ہے، کہ جنم لیتے وقت ماں دردزہ سے گزرتی ہے۔ گویا درد بھی (جڑواں) بھائی کی طرح ساتھ ہی جنم لیتے ہیں۔

سوال: سرائیکی قبیلہ ہے یا قوم؟ سرائیکی معاشرے کے بارے میں کچھ وضاحت کر دیں۔

جواب: سرائیکی کو کسی زمانہ میں ملتانی زبان بھی کہا جاتا تھا، یہ پنجابی اور سندھی زبانوں کی درمیانی کڑی ہے، جغرافیائی طور پر بھی سرائیکی بیلٹ (بہاولپور ، ملتان اور ملحقہ علاقے) پنجاب اور سندھ کے درمیان واقع ہے، اسی توازن یا درمیان کا اثر زبان میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

سوال: سرائیکی زبان کیا علاقائی زبان ہے؟ اگر ایسا ہے تو اردو اور اس میں کتنا فرق ہے؟

جواب: جی ہاں، سرائیکی علاقائی زبان ہے لیکن اس کا علاقہ خاص وسیع ہے۔ بہاولپور، ملتان، ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسماعیل خاں، میانوالی، جھنگ، یہ سارے سرائیکی علاقے ہیں جو پنجاب سے صوبہ سرحد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سندھ اور بلوچستان کے بعض علاقوں میں بھی سرائیکی بولی جاتی ہے اور میں نے خود بعض افغانیوں کو بھی سرائیکی بولتے سنا ہے۔ ظاہر ہے ان کے آباواجداد ملتان یا بہاولپور سے ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے ہوں گے۔ پرانی دکنی اردو میں سرائیکی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ شروع سے لے کر ولی دکنی تک کے اشعار میں ایسے الفاظ عام ملتے ہیں۔ سرائیکی میرے نزدیک دراوڑی عہد کی زبانوں کی ہی ترقی یافتہ یا کچھ تبدیل شدہ صورت ہے۔ اس کے لوک گیتوں میں دراوڑ کی نشانیوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ایک مشہور سرائیکی لوک گیت'' رانی پٹھانی ۔۔۔۔'' ہے۔ اس میں مختلف زیورات کا ذکر ہے اور سب کو'' دراوڑ کی نشانی'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

ا۔ کنگن توں گھڑا ڈے، دراوڑ دی نشانی ۔۔۔ ویرَن پَر نیاں آندا ہے، رانی پٹھانی (یعنی دراوڑ کی نشانی کنگن بنوا دو، میرا بھائی ایک پٹھانی رانی کے ساتھ شادی

کرکے آرہاہے)

☆☆ حیدرقریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارہ کیا ہےاورسچائی کونمایاں کیا ہے کہ Limit Situtation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتااور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہماراافسانہ تاریخ کےاس مکالمے سےشایداب تک غافل تھا۔حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے.....حیدرقریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنتے ہیں اور ان کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسارویّہ بھی شامل ہے جوکہانی سنتے ہوئے سوچنے پرمجبور کرتا ہے۔

پروفیسر جیلانی کامران

(یعنی دراوڑ کی نشانی کنگن بنوادو، میرا بھائی ایک پٹھانی رانی کےساتھ شادی کرکے آرہاہے)

۲۔ٹکاتوں گھڑاڈے، دراوڑ دی نشانی۔۔۔وِیرَن پَرنیاں آنداہِے، رانی پٹھانی
(یعنی دراوڑ کی نشانی ماتھے کاٹیکا بنوادو، میرا بھائی ایک پٹھانی رانی کےساتھ شادی کرکے آرہاہے)

اس طرح کوکا، مالا وغیرہ مختلف زیورات کا ذکر کیا گیا ہے۔بظاہر یہ عام سی بات ہےلیکن ایک تو یہ گیت سننے میں بہت میٹھا ہے، شادی بیاہوں پر خواتین شوق سے گاتی ہیں، دوسرے اس میں دراوڑی زیورات کا بار بار تذکرہ بہرحال ایک دلچسپ حوالہ ہے۔

سوال: خانپوراوررحیم یارخاں کے متعلق بھی کچھ بیان ہو، یہاں کی معروف شخصیات، ادبی فضا، خصوصیات وغیرہ۔

جواب: رحیم یارخاں، اورخانپوردونوں شہرسابق ریاست بہاولپور کے معروف شہرہیں، پچاس کی دہائی میں ساری ریاست کوپنجاب میں شامل کیا جاچکا ہے، لیکن الگ سرائیکی صوبہ یا بہاولپورصوبہ کی تحریکیں بھی وقتاً فوقتاً چلتی رہتی ہیں۔رحیم یارخاں ضلعی صدرمقام ہے، اورخانپور تحصیل ہیڈکوارٹر۔ملتان کے قریب ایک شہرکا نام میاں چنوں ہے۔یہ غیرمتعلق نام اس لئے لکھ رہاہوں کہ مجھے پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک معروف کمپئیر یادآگئے۔ان کا نام قریش پور ہے۔ایک بارکسی نے لکھا تھا کہ پاکستان ایسا ملک ہے جہاں شہروں کے نام رحیم یارخاں اورمیاں چنوں اورانسانوں کے نام قریش پورہوتے ہیں۔باقی میرے علاقے کےادبی ماحول اورشخصیات کا ذکرآپ کومیرے بعض خاکوں میں اورکھٹی میٹھی یادوں میں آسانی سے مل جائے گا۔

(یہ جواب نامہ ایک تحقیقی کام کے لئے عبدالرب استاد کی طرف سے کئے گئے تحریری سوالات پر ۴رنومبر ٢٠٠٦ءکوتحریرکیا گیا، جوگلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، انڈیا میں اردو کے استاد ہیں)

عمرلاحاصل کاحاصل

اکبرحمیدی (اسلام آباد)

تجارتی اورکاروباری حلقوں میں کسی خوش بخت تاجر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگرمٹی کوبھی ہاتھ لگادےتو وہ مٹی سونا بن جاتی ہے۔حیدر قریشی میرا عزیز دوست ہےاس کے بارے میں مَیں کہوں گا کہ اس نے جس صنفِ ادب کوبھی اپنے قلم سے مَس کیا اُسے بلندیوں کی وسعتوں تک پہنچا دیا ۔باوجود اس کے کہ اُس نے بہت سی اصناف ادب میں لکھا ہےمگر ہرایک کو سنجیدگی سے لکھا ہےاس لیے ہرصنف میں اپنی جودتِ طبع کے نئے گُل بُوٹے لگائے ہیں اوراپنی تخلیقی قوتوں کومنوایا ہے۔

میرااورحیدرقریشی کا رابطہ غالباً ١٩٧٠ء میں ہوا۔جب اس نے جدیدادب کا آغازاپنے آبائی شہرخان پور سے کیا۔جدیدادب کے ذریعے حیدر قریشی نے ایک عالمی اردوادب کی دنیا تخلیق کی ہے۔اب دیکھئے جدیدادب کاایڈیٹرحیدرقریشی خود جرمنی میں ہے۔پرچہ پاکستان میں تیارہوتا ہے۔شائع بھارت میں ہوتا ہےاوروہیں سے تمام اردودنیا میں بھیجا جاتا ہے۔اورلطف کی بات یہ ہے کہ مُفت بلا قیمت ہرکہیں ہرکسی کوبھجوایا جاتا ہے۔پرچے پرمحنت اپنی جگہ۔پرچے کی اشاعت پراخراجات اپنی جگہ اور پھر پرچے کومفت ہرطلبگار کو بھیجنا۔کیا اردو دنیا میں ایسا دلیراور جی دار مدیرآپ کوکہیں دکھائی دیا ہے؟ میرے خیال میں حیدرقریشی کےعلاوہ دوسرا نام آپ کونہیں ملے گا!! جدیدادب

ایک انٹرنیشنل رسالہ ہے جو دنیا کے بیشتر ممالک میں بھیجا جا رہا ہے!

بحیثیت شاعر ادیب کے اس نے ہر طرح کی نظم لکھی ہے۔۔

''ماہیا'' پنجابی شاعری کی مشہور مقبول صنف ہے۔ اردو میں حیدر قریشی نے اسے رائج کیا اور کچھ اس طرح رائج کیا کہ ماہیا ماہیا کرتا وہ خود ماہیا بن گیا۔ اس نے اس صنف کا پودا اردو کی سرزمین میں کچھ یوں کاشت کیا کہ اس کی آبیاری کے لئے لکھنے والوں کی ایک بڑی ٹیم جمع کر لی۔ ماہیا کے لئے وضاحتی اور تعارفی مضامین بھی لکھے اور ماہیئے بھی۔ اب بھی ''جدید ادب'' کے سرِ ورق پر ماہیا باقاعدگی سے چھپتا ہے۔ اردو ماہیا پر حیدر قریشی کا کام اس قدر وقیع اور وسیع ہے۔ کہ اردو ماہیا کی تاریخ میں اس کا نام امر ہو گیا ہے۔ حیدر قریشی نے افسانے بھی لکھے اور افسانہ نگاری میں اپنے لئے الگ راستہ نکالا۔ افسانوں کے دو مجموعے بھی شائع کروائے اور خوب نام کمایا۔ انشائیے کی تحریک جب زوروں پر تھی تب حیدر قریشی کے انشائیے بھی باقاعدگی سے ''اوراق'' میں شائع ہو رہے تھے۔ پھر اس کے انشائیوں کا مجموعہ بھی منظر عام پر آیا اور خیالات کے نئے پن کے باعث بہت پسند کیا گیا۔ یہ کام ایسے ہیں جن کے بارے میں لگتا ایسا ہے جیسے یہ اس کے ضمنی کام ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ حیدر قریشی کا کوئی کام بھی ضمنی نہیں بلکہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ مَیں تو سمجھتا ہوں اس نے حج اور عمرے کے جو سفر نامے تحریر کیے وہ بھی اردو ادب میں اپنی نوعیت کا بے حد منفرد کام ہے۔ ان سفر ناموں میں شاعر، نقاد، مورخ، سفر نامہ نگار ایک ہو گئے ہیں اور یوں ایسے ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جو اردو کے اور کسی سفر نامے میں نظر نہیں آتے۔ اس سے پہلے ممتاز مفتی کے حج نامے ''لبیک'' میں کچھ باتیں موجود تھیں مگر ان میں اتنی وسعت۔ بیباکی اور تاریخیت نہیں ہے۔ حیدر قریشی کے یہ سفر نامے بلاشبہ اردو ادب کا بے حد قیمتی اثاثہ ہیں جن پر ناقدین کو توجہ دینی چاہیئے۔ ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے نام سے حیدر نے اپنی یادیں قلم بند کی ہیں جو بہت خوش ذائقہ اور کراری ہیں۔ خاکہ نگاری میں حیدر قریشی نے اپنے افراد خاندان کے بہت دلچسپ خاکے لکھے ہیں جن میں اس کے والدین کے خاکوں کو اور تایا جی کا خاکہ بھولے سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ ان خاکوں میں انسانی مزاجوں اور انسانی نفسیات کی ایسی رنگا رنگی ملتی ہے۔ کہ قاری کے ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ خاکہ نگاری میں حیدر قریشی کا حوالہ غیر ادبی اور گھریلو شخصیات کے اعتبار سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

تنقید اگرچہ اس نے دوست نوازی کیلئے لکھی ہے مگر ایک ذہین آدمی ہونے کی حیثیت سے یہاں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے اور ان مضامین کو محض دوست نوازی نہیں بننے دیا بلکہ تنقیدی سرفرازی کے مرتبے تک پہنچا دیا ہے۔

غزل میں اس کا کام لب سوز۔ لب دوز کی حدود تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کے اوپر جا کر ذھن کے پھیلاؤ کا کام بھی کرتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر وہ اپنی غزل کا انتخاب چھپوا دے تو بڑے بڑوں کے چراغ بجھ جائیں۔ میں نے ہمیشہ اُسے غزل پر زیادہ توجہ دینے کو کہا ہے کہ مَیں اسکی غزلوں کے پس منظروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ مَیں نے اس کی لگتی بھی دیکھی ہے اور ٹوٹتی بھی۔ پھر ٹوٹنے میں ''تڑک'' کی آواز بھی سُنی ہے اسکی غزل ''میری لگدی کسے نہ دیکھی۔ تے ٹٹڈی نوں جگ جان دا'' کی آواز ہے۔

اس کی غزل کی اس ''ٹوٹتی ہوئی'' کو بھی زمانہ سنے گا اور اس سننے میں وہ سب کچھ دیکھ بھی لے گا۔

عمر لا حاصل کا یہ حاصل تو بہت بڑا حاصل ہے جو کسی خوش بخت کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ حیدر قریشی مبارک باد اور زندہ باد۔

حیدر قریشی۔ایک سرسری مطالعہ

سہیل احمد صدیقی (کراچی)

جوشؔ ملیح آبادی کو عموماً 'شاعر انقلاب' کہا جاتا ہے' مگر میں اپنی باغی سوچ کے سبب کئی برس پہلے انہیں '' شاعر بغاوت'' قرار دے چکا ہوں' جس پر بعد از آں ایک خاتون کے مقالے نے مہر تصدیق ثبت کردی......میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ '' توڑ دو' پھوڑ دو' مار دو' جلا دو' گرا دو' کے نعروں سے بھرپور شاعری بغاوت کا درس تو ضرور دیتی ہے' انقلاب کا نہیں' جو نام ہے نظام کی مکمل اور مثبت تبدیلی کا۔ یہاں یہ حوالہ یوں یاد آیا کہ آج میں حیدر قریشی جیسی مختلف الجہات (multi-dimension) شخصیت کو یہی لقب دے رہا ہوں' مگر دوسرے تناظر میں۔ پانچ شعری مجموعوں کے خالق حیدرؔ نے متعدد شعری' سماجی اور لسانی روایات سے بغاوت کر کے اپنی راہ الگ نکالی ہے۔

ہمارے یہاں جدت پسندی کے آغاز سے قبل ترقی پسندی کے نام پر بہت کچھ ہوا' ناشاعر بھی شاعر کہلائے' پراپیگنڈا اور نعرے بازی کو شاعری کے اصل ایڈیشن کے طور پر پیش کیا گیا پھر جدت پسندی نے مزید راہیں کھولیں......راقم ادب پر کسی ٹھپے کا قائل نہیں' شاعری نہ تو صرف گل و بلبل کی داستاں ہونی چاہیے نہ ہی مقصدیت یا سیاسی پرچار کا واحد آلہ کار...... یہ ضروری نہیں کہ شاعر ہر لفظ تراشنے سے قبل قارئین اور ناقدین کو ذہن میں رکھے نہ ہی یہ لازم ہے کہ تمام شاعری اپنی ذات کے اظہار کے لیے' محض اپنے لیے کی جائے۔ اسی طرح روایت کسی ایسے بت کا نام نہیں جسے پاش پاش کر کے ''محمود بت شکن'' بننا مستحسن ہو'نہ ہی روایت کا ہر حال میں احترام واجب ہے...... یہ نکات مدنظر رہیں تو روایت پسند ہوتے ہوئے روایت شکنی کا امکان واضح رہتا ہے۔ حیدر قریشی میرے نزدیک ایسا ہی شاعر ہے جس نے نظم و غزل' ماہیا اور دوہا سمیت تمام اصناف میں '' بیچ کی راہ'' نکالی ہے۔ وہ مقامی لب و لہجے کو سمونے کی شعوری و لاشعوری مساعی میں بہت سے اردو شعراء سے آگے ہے (تفصیل آگے آئے گی)' مگر اس کا سیاسی انداز میں پرچار نہیں کرتا۔

''سلگتے خواب'' کی پہلی غزل سے بلند آہنگ اور تیز لے کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو '' درد سمندر'' کے آخر تک' بلکہ مابعد کلام میں بھی برقرار رہتا ہے۔ مذکورہ غزل میں کچھ اشعار بالکل روایتی سے لگتے ہیں' البتہ مطلع اور دوسرا شعر توجہ چاہتے ہیں:

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر' فُرات آنکھوں میں

☆ تلمیح' استعارہ اور صنعت تضاد کا کیسا عمدہ مجموعہ ہے!

پھر اس کو دامن دل میں کہاں کہاں رکھیں
سمیٹ سکتے ہیں جو کائنات آنکھوں میں

☆ یہ گویا شاعر سے ایک عام قاری کے طفلانہ سوال کا شعری روپ ہے...... تشریح بہ انداز دگر یقیناً واضح ہے!

صنعت تضاد یہاں بھی منفرد ہے:

اس نے پتھرا دیا مجھے حیدرؔ
دیکھنے میں جو آئینہ رُو ہے

صنم کو پتھر کہنا' بت کہنا' سنگ دل کہنا تمام روایتی شعراء کے یہاں عام ہے۔ حیدر قریشی نے عوامی ترکیب استعمال کرتے ہوئے ذرا مختلف دعویٰ کیا ہے جس سے اس کے 'جری عاشق' ہونے کا پتہ چلتا ہے:

وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنہیں چھولیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

اسی پر بس نہیں' وہ محبوب کو اس طرح بھی مختلف صفات کا حامل قرار دیتا ہے:

وہ چاند' وہ گلاب' وہ پتھر' وہ آگ بھی
جیسی مثال دیجئے' برحق مثال ہے

یا پھر:

نہ پورا سوچ سکوں' چھو سکوں نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند' کبھی گل' کبھی کتاب لگے

جرأت' بے باکی اور گستاخی کے دعوے اپنی جگہ مگر رعب حسن بھی اس قدر طاقتور ہے کہ شاعر یہ کہنے پر مجبور نظر آتا ہے:

اس سے آنکھیں چار کرنے کا کہاں ہے حوصلہ

جب وہ اپنے دھیان میں ہو تب اسے تم دیکھنا

☆

ساعتِ اظہار سے اقرار کے لمحے تلک
لفظ، معنی ہی نہ کر بیٹھیں کہیں گم دیکھنا

صنعت تضاد میری پسندیدہ صنائع میں ایک ہے جس کا عمدہ، برمحل اور مستحسن استعمال جدید شاعری میں کم کم ہوا ہے۔ حیدر نے یہ شعر قدماء کے انداز میں کہہ کر گویا ''خالص زبان'' کے شاعروں سے سند حاصل کر لی ہے:

کئی خوش نظر سے گماں لیے، گئے ہم بھی کاسۂ جاں لیے
پڑا واسطہ تو پتہ چلا وہ سخی بھی کتنا بخیل ہے

عہد قدیم سے مکرر نظم ہونے والے خیالات میں ۔ من تو شدم، تو من شدی بھی شامل ہے۔ حیدر نے اسے بہ انداز دگر برتا ہے:

اندر کی دنیائیں ملا کے ایک نگر ہو جائیں
یا پھر آؤ مل کر ٹوٹیں اور کھنڈر ہو جائیں

کسی فرسودہ خیال سے کشید یا اس کی نئی بندش میرے نزدیک لائق تحسین ہے۔ کراچی کے ایک بزرگ شاعر کے کلام میں جا بجا اس کی نشان دہی کر کے ان کی ناراضی مول لے چکا ہوں......خیر یہاں حیدر کی شاعری زیر بحث ہے جو روایت سے انحراف بھی ایسا کرتا ہے کہ اس کی بغاوت اکثر لائق نفرین نہیں بلکہ لائق تقلید محسوس ہوتی ہے۔ اس کا یہ شعر بھی ایک نئی ترکیب کے برجستہ استعمال کے سبب اس کی پہچان کہلا سکتا ہے:

کترائے وہ کبھی تو کبھی میں جھجک گیا
اک بھی کنول کھلا نہ حجابوں کی جھیل میں

جدت طرازی کی باتیں بہت اور مثالیں تھوڑی ملتی ہیں......حیدر قریشی نے ایسے شعر کہے ہیں جو واقعی جدید ہیں، تازہ ہیں اور نیا مضمون لیے ہوئے ہیں۔

خیالوں پر مرے چھائے ہو جب سے
بہت ہی خود پہ اترانے لگے ہو

اسی غزل کا مطلع دیکھیے جو یقیناً مضمون آفریں ہے:

مِری نیندیں بھی مہکانے لگے ہو
کہ خوابوں میں بھی دَر آنے لگے ہو

☆ ''در آنا'' غالباً ہمارے یہاں کبھی بھی مثبت استعمال نہیں ہوا۔ وہ ایک قدم بڑھ کر اسی سرشاری کو مزید واضح کرتا ہے:

آنکھ کس طرح کھلے میری کہ میں جانتا ہوں
آنکھ کھلتے ہی سبھی خواب اجڑ جاتے ہیں

امید و بیم کی کیفیت محض عاشق مزاج شاعر کو دیوانہ نہیں بناتی، ہر کس و ناکس اس سے دوچار ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ حیدر کی اس غزل کا مطلع دیکھیے، پھر اسی تسلسل میں تیسرا شعر:

پلکوں پہ تیری یاد کے منظر بکھر گئے
جیسے ستارے سینۂ شب میں اتر گئے
ہم تشنگی میں ڈوبے ہوئے دیکھتے رہے
ٹھنڈی ہوا سے کھیلتے بادل گزر گئے

اسی مجموعہ کلام میں اس کی رجائیت اس طرح بھی جلوہ گر ہے:

کبھی تو مانگ کا سیندور بن ہی جائیں گے
اس ایک آس پہ قدموں میں تیرے دھول ہوئے

اکثر شعراء خزاں کا استعارہ عموماً منفی اور خصوصاً یعنی کبھی کبھار (مجھ ایسے من چلے) مثبت استعمال کرتے ہیں۔ حیدر قریشی کا کہنا ہے:

زندگی کی ہر برہنہ شاخ پر تحریر ہیں
پھول چہروں پر جو ٹوٹے زرد لمحوں کے عذاب

یادنگاری اکثر ''عشق زدہ'' سخنور حضرات کا محبوب مشغلہ ہے، حیدر اسی قبیل کا شاعر ہے جو اس ضمن میں ندرت خیال کی سعی کرتا رہتا ہے:

سانپ بن کر ڈس گئیں اک دن لکیریں ہاتھ کی
قسمتوں میں رہ گئے اب صرف یادوں کے عذاب

شاخِ دل یوں تری یادوں سے ہری رہتی ہے
جیسے میووں سے کوئی ڈال بھری رہتی ہے

حیدر کی ایک غزل میں اس شعر نے مجھے چونکا دیا......کوئی اپنے جنون کا اظہار، وہ بھی محبوب کو مخاطب کر کے یوں بھی کر سکتا ہے:

میں برگ خشک ہوں، تو کوئی سر پھرا جھونکا
اب آ بھی جا کہ مجھے ٹوٹ کر بکھرنا ہے

☆ ''فنافی العشق'' کا نادر مضمون ہے، وہ بھی عشق مجازی میں!
معاملات کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے موصوف نے بہت کچھ کھل کر کہا ہے

لیکن وہ قدماء یا بعض جدت پسند شعراء کی طرح عشق کو پاکیزہ مقدس قرار دینے کا قائل نہیں:

بس پیار کو بھی پیار کی حد تک ہی نبھائیں
دل، دل ہے کسی پیر کی درگاہ نہیں ہے

عشق پیشہ شاعر قنوطیت میں آگے بڑھتا ہے تو ''قدری'' یا ''جبری'' عقیدہ اپنا کر دہریت سے ناتہ جوڑ لیتا ہے (ناطہ غلط ہے)، میرؔ اور یاسؔ کی مثالیں مشہور ہیں، گرچہ غالبؔ بھی کہیں کہیں اس صف میں شامل ہوتے دکھائی دیتے ہیں......حیدؔر اپنے تمام معاملاتِ زندگی سے قطع نظر خدائے عزوجل سے امید کا رشتہ بہرحال قائم رکھنا چاہتا ہے:

وہ حساب تو لے گا، پر حساب کیا دیں گے
ہم گناہ گاروں کو کب حساب آتا ہے

اولین مجموعہ کلام میں حیدؔر نے سیاسی تناظر میں بہت چبھتے ہوئے، طنز آمیز شاہکار بھی پیش کیے،

خوفِ طوالت سے ان کا ذکر چھوڑ رہا ہوں۔ اسی طرح جوشؔ ملیح آبادی کا فطری خاصہ 'نظم مسلسل' ہے (کہ ان کی غزل میں بھی پائی گئی)......ایک جگہ حیدر قریشی کی غزل میں بھی نظم مسلسل محسوس ہوئی۔ غزل کا مطلع ہے:

نہ جانے کون سازشوں کا ہم شکار ہو گئے
کہ جتنے صاف دل تھے اتنے داغ دار ہو گئے

☆ کون سی کی بجائے صرف 'کون' کا استعمال مقامی (غالباً پنجابی) ہے۔ اس طرح کی کچھ مثالیں ہمارے قدماء کے یہاں بہرحال ملتی ہیں۔ مقطع ذرا تفننِ طبع کے لیے ''ہٹ کر'' کہا گیا:

کنارِ آب حیدؔر اپنا منہ لیے کھڑے رہے
گھڑے کے بدلے کار میں وہ پُل سے پار ہو گئے

☆ بہت کچھ کہنے کرنے اور سننے سنانے کے بعد حیدر قریشی کو باقاعدہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی شروع کر دینی چاہیے۔

بات چلی تھی حیدؔر کی مقامی لب و لہجے، الفاظ، تراکیب، تذکیر و تانیث حتیٰ کہ خیال کے برتنے کی......اس ضمن میں مثالیں ملاحظہ کیجیے:

مِرے ہی خواب کنوارے نہیں رہے اب تو
کہ آرزوئیں تری بھی بیاہیاں نہ گئیں

☆ اس غزل میں پنجابی انداز کی جمع تراکیب کبھی کبھی قدیم (متروک) اردو کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ پہلے مجموعے میں جا بجا اس انداز کو برتنے کے بعد دوسرے مجموعہ کلام ''عمر گریزاں'' میں بھی شامل ایک غزل کے قوافی خوش خیالیاں، لاابالیاں، نرالیاں، پیار والیاں، لالیاں، ڈالیاں، بے اعتدالیاں، سالیاں کا استعمال شاید چونکانے اور ایک اور ''معرکہ حیدری'' برپا کرنے کی شعوری کاوش ہے!

رقصاں تھی اس طرح تری یادوں کی آبشار
کہسارِ دل کے، جھانجھروں سے گونجتے رہے

☆ شعر میں مقامی فضاء تو داد طلب ہے، مگر 'آبشار' کو مونث باندھنا پنجابی ہے.....لکھنؤ اور پنجاب میں سانس، دہی سمیت متعدد الفاظ کا مونث ہونا مشترک ہے، ممکن ہے یہ بھی اسی طرح کی مثال ہو۔

قدیم یا متروک الفاظ کے استعمال کی اعلیٰ مثال دیکھیے:

نہیں وہ رنگ پہ رنگوں سا عکس ہے اس کا
نہیں وہ پھول پہ پھولوں سی باس رکھتا ہے

☆ '' پہ'' بمعنی پر، لیکن متروک ہے (راقم کی ایک غزل میں بھی شعری ضرورت کے تحت موجود ہے)......باس بمعنی خوشبو (یا صرف بو) کا استعمال اردو میں شاذ ہی نظر آتا ہے۔ (نکات سخن از حسرتؔ موہانی میں مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں)۔

یہ عشق وِشق، یہ ساری محبتیں حیدؔر
مجھے تو سب ترے دل کا فتور لگتا ہے

☆ کہیے یہ عوامی بلکہ دہقانی انداز کیسا ہے؟؟

بس اتنی بات تھی، دو دل کبھی نہ مل پائیں
کہیں پہ تپتے ہوئے تھَل، کہیں چناب ہوئے

مقامی استعاروں کا استعمال بدیع ہے، مگر اسی غزل میں شاعر موصوف یہ کہہ کر چونکاتے ہیں:

ذہانتیں تھیں تری، یا اناڑی پن اپنا
سوالِ وصل سے پہلے ہی لاجواب ہوئے

☆ ایک ہی شخص کی کئی ذہانتیں......یا مظہر العجائب!

اس نے تو دکھائے تھے کئی خواب کے منظر
نادان تھے ہم آپ، ہی نے نہیں دیکھے

☆ 'ہی' کا استعمال بھی قدیم اردو اور پنجابی میں مشترک مگر اب ہمارے یہاں

متروک ہے۔

اک فریبی کا شُوکتا سا پیار

روح کی آستین ڈھونڈتا ہے

☆یہ خالص پنجابی لفظ کتنے اردو گو قاری سمجھ پائیں گے؟؟

لسانی اعتبار سے حیدؔر کی بغاوت پر آمادہ طبیعت ایسے شعر کہلواتی ہے:

ہم تہی دست آبروئے فقر

سود دے کر زیاں مانگتے ہیں

☆''زیاں'' کا اعلانِ نون بر بنائے قافیہ پیمائی پہلی بار دیکھا ہے۔

گھر تو ہے اپنا ایک سوا یسے بچھڑ لیے

تم اپنے گھر کو چل پڑے، ہم اپنے گھر گئے

☆پہلے مصرع کا خط کشیدہ حصہ پنجابی لگتا ہے۔

اقبالؔ اور ایم ڈی تاثیر کی طرح حیدر قریشی بھی اردو میں پنجابی طرز پر'' مجھے یہ کرنا ہے'' کی بجائے ''میں نے کرنا ہے'' وغیرہ کا قائل ہے......راقم اس ضمن میں کٹر پنتھی ہے!

پنجابیت کی مزید مثال:

درد اندر کے سب آنکھوں میں ابھر آئے تھے

عشق میں جب ہمیں پانی کے سفر آئے تھے

اسی غزل میں ایک محاورے میں ترمیم:

آپ نے ہی درِ دل وَا نہ کیا تھا ورنہ

صبح کے بھولے تو دوپہر کو گھر آئے تھے

''عمرِ گریزاں'' کی پہلی غزل کا یہ شعر حاصلِ غزل ہے:

جیسے اب چاہے تو سلوک کرے

آج سے ہم ترے رہین رہے

پیچھے ذکر ہوا یاد نگاری کا' خواب نگاری کا' اب ذرا یہ اچھوتا خیال ملاحظہ کیجیے:

روز طوفان اٹھانے کی مشقت تھی اسے

دشت بے چارے کو آرام ملا میرے بعد

☆میرؔ و غالبؔ' جن کا ذکر مقطع میں ہے' آج زندہ ہوتے تو اس شعر پر حیدؔر کو ضرور سراہتے!

اس مجموعے میں بعض جگہ شاعر نے ان اہلِ علم کو نشانہ تنقید بنایا ہے جو انتقالِ علم کی سعی نہیں کرتے اور دفینہ سینے میں لیے مر جانا پسند کرتے ہیں:

تم اہلِ علم و فضل ہو لیکن کچھ اس طرح

جیسے کوئی کتاب ہو دیمک لگی ہوئی

کہیں کہیں حیدؔر صاف گوئی کی آخری حد کو پہنچ کر یہ کہہ دیتا ہے:

ڈھنگ کا کام کوئی ہم سے کبھی ہو نہ سکا

یوں تو سرسوں بھی ہتھیلی پہ جمالی ہم نے

اور پھر اپنے مخالفین کو یہ چیلنج دینا بھی نہیں بھولتا کہ

آخری مرحلہ اس کھیل کا رہتا ہے ابھی

خوش نہ ہو لشکرِ اعداء مری پسپائی سے

کیوں کہ وہ بجا طور پر سمجھتا ہے کہ

یونہی تک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدؔر

بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

''دعائے دل'' کی ایک غزل اس کے مزاج کی سچی عکاس ہے:

چاہے وہ بال بچوں والی ہے — دل کی منطق مگر نرالی ہے

اب تماشا تو خود بخود ہوگا — بات خود آپ نے اچھالی ہے

موت کو چھو کے دیکھنا ہے ذرا — زندگی اپنی دیکھی بھالی ہے

روح میری بھی ہے کھرا سونا — تیری دنیا اگر کٹھالی ہے

دکھ تو بے شک بہت ہوا لیکن — اس کی چاہت تو آزمالی ہے

دوستی میری بے مثال ہے تو — دشمنی بھی مری مثالی ہے

بیج بویا تھا پیار کا حیدؔر

لگتا ہے فصل پکنے والی ہے

مجھے حیدر قریشی کا تمام مطبوعہ کلام ایک سے زائد مرتبہ بہ نظرِ غائر پڑھنے کا موقع ملا' یہاں تمام کلام سے صنائع بدائع کی خوشہ چینی سے بسبب اختصار صرفِ نظر نیز اس کی ماہیا نگاری پر تبصرہ محض خوفِ طوالت سے ترک کرتا ہوں......ضمناً عرض کر دوں کہ حیدؔر کے اس خورد نے اسی کی فرمائش' حوصلہ افزائی اور تعاون سے اردو ماہیا پر پہلا انگریزی مضمون 'ڈان' کے لیے رقم کیا تھا (مورخہ ۲۵ اپریل ۲۰۰۲ء) سو اس باب میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہنی چاہیے۔

حیدر قریشی کی ادبی خصوصیات و جہات

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد
چیئرمین شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی۔ بہاولپور

میں دیکھتا ہوں کہ محمد رفیع سوداؔ اپنے ایک نثری دیباچے نیز شاعری میں قصیدوں، غزلوں، شہرآشوبوں اور ہجویات کے لیے مشہور ہیں۔ میر تقی میرؔ خودنوشت سوانح عمری، تذکرے اور شاعری میں غزل و مثنوی کے حوالے سے معروف ہیں۔ غالبؔ فارسی اور اُردو غزل، قصیدے، کچھ علمی مباحث اور مکاتیب کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ حیدر قریشی، سوداؔ، میرؔ اور غالبؔ نہیں ہیں تو بھی ''عمر لا حاصل کا حاصل''(۱) کے ٹائٹل پر دی گئی چودہ کتابوں کے مصنف کے طور پر یاد رکھے جانے کے لائق ہیں لیکن یہ چودہ کی گنتی بھی تو نامکمل ہے۔ اس لیے کہ منزہ یاسمین نے اپنی کتاب میں ان چودہ کتب کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے جو تخلیقات بھی ہیں، ترتیب کی ذیل میں بھی آتی ہیں اور جن کی روشنی میں حیدر قریشی نقاد اور مدیر کی صورت بھی حاصل کرتے ہیں۔(۲) لیکن اس گنتی میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ حیدر قریشی نے ''غزلیں، نظمیں ماہیے'' کی صورت میں چار الگ کتابوں کو یکجا کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی ہے۔ اس کے علاوہ حیدر قریشی کی ایسی کتابیں بھی ہیں جو تاحال چھپ کر بوجوہ تقسیم نہیں ہوئیں مثلاً '' منظر اور پس منظر'' وغیرہ۔ یوں دیکھیں گے تو حیدر قریشی کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں شامل ہوتے ہیں لیکن زیادہ لکھنے کے باوجود حیدر قریشی معیار پر بھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔

حیدر قریشی کو ایک اور صورت میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بڑے بڑے شعراء اور ادباء کے لکھنے کی سمتیں چند ایک اور متعین ہیں۔ مثلاً قرۃ العین حیدر افسانہ، ناول اور ناول کے آزاد ترجمے کے حوالے سے مشہور ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اپنی شاعری، افسانوں، ادبی رسائل کی ادارت اور اخباری کالم کی وجہ سے معروف ہیں۔ لیکن حیدر قریشی کسی ایک آدھ صنف پر بند نہیں۔ مثلاً شاعری میں ''غزلیں، نظمیں اور ماہیا''، قصے کہانیاں، افسانے اور انشائیے وغیرہ کے ساتھ ساتھ ان سے منسوب ایسے موضوعات بھی ہیں جن کے لیے ہمیں ازسرِنو نئے نام ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ مجھے اس وقت بہت اچھا لگا تھا جب ہماری ایک طالبہ طاہرہ ناز نے نسیم حجازی کی کچھ تحریروں مثلاً ''سفید جزیرہ''، ''پورس کے ہاتھی''، ''ثقافت کی تلاش'' اور ''سو سال بعد'' وغیرہ کے لیے ''خیالیہ'' کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔(۳) جب کہ حیدر قریشی تو موضوعات اور عنوانات بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں مثلاً دردسمندر، روشنی کی بشارت، ایٹمی جنگ، میری محبتیں، کھٹی میٹھی یادیں، عمر لا حاصل کا حاصل اور منظر اور پس منظر وغیرہ۔ مزید یہ کہ انہوں نے اپنی بعض تحریروں کے لیے یادنگاری کی اصطلاح وضع کی ہے اور اس میں جن موضوعات پر لکھا ہے وہ اس سے پہلے اُردو ادب میں کہیں نہیں ملتے۔ ہمارے ہاں ایک مشکل یہ بھی آپڑی ہے کہ لوگ تخلیقی فکر کے چکر میں سچ سے دور چلے جاتے ہیں یا پھر ان کے سچ میں سے تخلیقی عنصر غائب ہو جاتا ہے۔ حیدر قریشی کے ہاں یہ دونوں مشکل صورتیں پیدا نہیں ہوئیں۔ مثلاً ''عمر حاصل کا لا حاصل'' کا عنوان ہی ہماری توجہ کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جب کہ ''منظر اور پس منظر'' کا انتساب ہی قابل توجہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''صدرِ پاکستان
جنرل پرویز مشرف کے نام
جنہوں نے بالکل جائز بنیاد پر ملک کا اقتدار سنبھالا جنہوں نے یکا یک بدلتے ہوئے عالمی حالات میں بہت سے ناگوار سہی مگر بروقت اور درست فیصلے کیے، جنہوں نے اقتصادی لحاظ سے ڈوبتے ملک کو کسی قدر سہی، اقتصادی زبان میں سنبھالا دیا

لیکن

جنہوں نے اندرون ملک قومی دولت لوٹنے والوں سے کسی سیاسی امتیاز کے بغیر ملک کی دولت واپس لانے کا سب سے اہم اور بنیادی فرض فراموش کر دیا ہے، اور جو اپنی سیاسی مجبوریوں کے باعث بہت سے بڑے چوروں کا سیاسی تعاون حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنے سیاسی سیٹ اَپ میں حصہ دار بنائے بیٹھے

ہیں۔''(۴)

اس انتساب کی خوبی یہ ہے کہ یہ آج سے آٹھ سال پہلے بھی اسی قدر درست تھا جس قدر آج درست ہے اور اگر جنرل پرویز مشرف نے تیزی کے ساتھ کچھ سیاسی اقدامات نہ کیے تو اس کے نتائج بھی اسی قدر خراب ہوں گے جن کی طرف انتساب کی آخری سطور میں اشارہ کیا گیا ہے۔

میں یونی ورسٹی میں استاد ہوں۔ میرا کام ہی لکھنا پڑھنا ہے لیکن مجھے میرے شہر میں بھی کوئی نہیں جانتا اور یہ حالت صرف میری ہی نہیں بلکہ پاکستان کی جامعات کے نوے فی صد اساتذہ کی ہے جب کہ حیدر قریشی پاکستان و ہند کے تمام پڑھے لکھے حلقوں میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔حیدر قریشی کراچی، حیدر آباد، خیر پور میرس، کوئٹہ، بہاول پور، لاہور، فیصل آباد، سرگودھا، راول پنڈی، اسلام آباد، پشاور اور ملتان کے ہر ادبی حلقے میں جانے، پہچانے، چھپتے اور شائع کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملتان سے شائع ہونے والے ترقی پسند ادب کے ترجمان ''انگارے'' مرتبہ سیّد ڈاکٹر عامر سہیل نے حیدر قریشی کو اکتوبر ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔(۵) حیدر قریشی کا چھپنا محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس سے اگلے شمارے میں حیدر قریشی کی آٹھ غزلیں شائع ہوئی ہیں۔(۶) اسی طرح حیدر قریشی ہندوستان، ماریشس، برطانیہ، جرمنی، کینیڈا اور امریکہ کے بھی زیادہ تر اُردو اخبارات ورسائل میں چھپ رہے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ حیدر قریشی پر باقاعدہ کتب ومقالات بھی شائع ہو رہے ہیں۔مثلاً ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' میں انتساب سے پہلے صفحہ نمبر۲ پر حیدر قریشی کے فن اور شخصیت کی تفہیم کے حوالے سے پانچ کتب کا حوالہ دیا گیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ حیدر قریشی فکر وفن، صفحات ۱۴۴، مصنف محمد وسیم انجم (مطبوعہ ۱۹۹۹ء)، ناشر انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر۳، راول پنڈی پاکستان

۲۔ حیدر قریشی فن اور شخصیت، صفحات ۱۹۲، مرتب نذیر فتح پوری (مطبوعہ ۲۰۰۲ء) ناشر اسباق پبلی کیشنز، پونا، انڈیا

۳۔ حیدر قریشی کی ادبی خدمات، صفحات ۳۰۶، مرتب نذر خلیق (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) ناشر میاں محمد بخش پبلشرز خان پور، پاکستان

۴۔ حیدر قریشی شخصیت اور فن، صفحات ۲۷۰، تصنیف منزہ یاسمین، منزہ یاسمین کا ایم۔اے کا تحقیقی مقالہ، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور سے مطبوعہ ۲۰۰۳ء

۵۔ انٹرویوز، صفحات ۱۶۰، مرتب سعید شباب، ناشر نظامیہ آرٹ اکیڈمی، ایمسٹرڈیم، ہالینڈ''(۷)

حیدر قریشی پاکستان میں تھے تو انہوں نے ''جدید ادب'' کے نام سے ایک ادبی پرچہ جاری کیا تھا۔ جرمنی چلے گئے تو یہ پرچہ بند ہو گیا۔لیکن اب پھر ایک عرصے سے ''جدید ادب'' جاری ہے۔ یہ کبھی پاکستان سے نکلتا ہے اور کبھی انڈیا سے۔لیکن یہ کہیں سے بھی نکلے اس میں دنیا بھر کے منتخب ادیب وشاعر اور مضمون نگار حضرات کو جگہ ملتی ہے۔ یہ الگ بات کہ اس حوالے سے حیدر قریشی اور ڈاکٹر نذر خلیق اپنے مزاج کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔مثلاً حیدر قریشی ہمت رائے شرما اور ماہیے کی صنف کے قدر دان ہیں۔وزیر آغا سے ان کا خصوصی تعلق ہے لہٰذا جہاں اور جب کبھی موقع ملتا ہے ''جدید ادب'' میں وزیر آغا، ہمت رائے شرما اور ماہیا ضرور نظر آتے ہیں بلکہ ''جدید ادب'' کے ٹائٹل پر حیدر قریشی کا ایک ماہیا ضرور ہوتا ہے۔

میں اس سے پہلے حیدر قریشی پر اپنے ایک مضمون میں ایک خاص بات کہہ چکا ہوں اور وہ یہ کہ اگر ہم کلیاتِ میؔر کا مطالعہ کریں تو ہم اس کے ذریعے میؔر کے حالاتِ زندگی تک نہیں پہنچتے بلکہ اس کی تحریریں اپنے قارئین کو مزید گمراہ کرتی ہیں۔یہی حال غالبؔ اور اُردو کے دوسرے شعراء کا بھی ہے لیکن حیدر قریشی کی شاعری درحقیقت ان کی زندگی کا ایسا آئینہ ہے جس میں ان کی زندگی کے تقریباً سبھی اُتار چڑھاؤ اور دُکھ درد دیکھے جا سکتے ہیں۔(۸)

حیدر قریشی کی زندگی کا ایک المیہ یہ ہے کہ ہمارے بہت سے معلّمانہ تنقید لکھنے والے لوگ اپنے تیس تیس سال پہلے کی معلومات کو سینے سے لگائے زندگی گزارنے پر مجبور اور بضد ہیں اور انہیں بالکل نہیں معلوم کہ حیدر قریشی کی زندگی میں ''آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پر اڑنا'' کا روّیہ موجود نہیں۔اگر انہیں آج بھی ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی فکر میں کہیں کوئی کجی نظر آئے گی تو وہ اپنی پرانی نیاز مندیوں کے باوجود اپنا راستہ بدل لیں گے۔دیکھیے اپنے آباء واجداد کے عقیدے کو ترک کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ حیدر قریشی اس حوالے سے بھی پیش قدمی کر چکے ہیں۔''سوئے حجاز'' اور کئی عمرے اس کی بیّن شہادت ہیں۔لیکن

☆☆حیدر قریشی اردو غزل کے نئے افق پر ایک سپوتنک کی طرح بلند ہونے والے ہمارے چند نوجوان شعراء میں شامل ہے۔ حیدر کا شعر دردمند بھی ہوتا ہے اور خوش آہنگ وخوش رنگ بھی۔ وہ اپنی تخلیقی فصل کے کسی خوشے، بالی، ٹانڈے کو دیمک نہیں لگنے دیتا۔ اڑتا ہے تو زمین کو ساتھ لے کر اڑتا ہے۔ ہماری جدید غزل میں ایسی اجلی اور پھر ایسی ''مٹیالی'' شاعری کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ میرے نزدیک حیدر قریشی شعراء کے اس عمدہ گروہ کے سرپنچوں میں سے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو جدید غزل کی وہ ساکھ نہ ہوتی، جو ہے۔

سید ضمیر جعفری

بعض اوقات کچھ چیزیں حیدر قریشی کے حوالے سے مشکل بھی پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص آمریت پسند ہے تو اسے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے لے کر جنرل مشرف تک آمریت پسند ہی ہونا چاہیے اور اگر کوئی آدمی جمہوریت کا دل دادہ ہے تو جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف کی حمایت بھی حیدر قریشی کی فکر کی کجی کو سامنے لائے گی۔ اس حوالے سے حیدر قریشی کو اپنی فکر کی درستی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

حواشی:

۱۔ ''عمر لا حاصل کا حاصل''، حیدر قریشی، معیار پبلی کیشنز، گیتا کالونی دہلی، انڈیا، ۲۰۰۵ء

۲۔ ''حیدر قریشی شخصیت اور فن''، منزہ یاسمین، فہرست ابواب، صفحہ نمبر ۲ تا ۳، مقالہ برائے ایم اے اُردو، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، شعبۂ اُردو و اقبالیات، ۲۰۰۲ء۔ ۲۰۰۰ء

۳۔ ''نسیم حجازی اور علامہ اقبال''، طاہرہ ناز، مقالہ برائے ایم۔ فِل اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

۴۔ ''منظر اور پس منظر''، حیدر قریشی، انتساب صفحہ نمبر ۳، سرور ادبی اکادمی، جرمنی، ۲۰۰۴ء

۵۔ ''ادبی کائنات میں رنگ''، حیدر قریشی، ''انگارے''، مرتبہ ڈاکٹر سیّد عامر سہیل، اکتوبر ۲۰۰۷ء

۶۔ ''۸ غزلیات''، حیدر قریشی، مشمولہ ''انگارے''، مرتبہ ڈاکٹر سیّد عامر سہیل، نومبر ۲۰۰۷ء

۷۔ ''عمر لا حاصل کا حاصل''، حیدر قریشی، صفحہ نمبر ۲

۸۔ ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات''، مرتبہ پروفیسر نذر خلیق، حیدر قریشی کی شاعری، از ڈاکٹر شفیق احمد، ص ۱۰۲ تا ۱۱۶، میاں محمد بخش پبلشرز، خان پور، ۲۰۰۳ء

اردو ماہیا اور حیدر قریشی

عبدالرب استاد۔ (گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ)

بات جب ماہیے کی ہو استاد
ذکرِ حیدر وہاں ضروری ہے

اردو اصناف سخن میں جب کبھی غزل کا ذکر ہو، میر و غالب کی یاد نہ آئے۔ قصیدے کی بات ہو، سودا اور ذوق دماغ میں نہ آئیں، مثنوی کا بیان ہو اور میر حسن کا خیال نہ آئے۔ مرثیہ کی بحث ہو، انیس و دبیر کو بھول جائیں، نظم پر مکالمہ و، نظیر و اقبال پر کلام نہ ہو، یہ نہ ممکنات میں سے ہے تو یقیناً یہ بھی ناممکن ہے کہ ماہیئے کی بات چلے اور حیدر قریشی کا ذکر نہ ہو۔ ماہیا اور حیدر قریشی لازم و ملزوم ہیں۔

ماہیا جسے پنجابی لوک گیت، یا گائی جانی والی نظم کہا جاتا ہے (اور واقعتاً یہی ہے) اسے با قاعدہ اوزان اور بحور کے زیور سے مزین و آراستہ کر کے ایک علاحدہ صنف سخن کا درجہ دلانے میں حیدر قریشی کی کوشیش اور کاوشیں تاریخی حیثیت رکھیتی ہیں۔ قطع نظر اس کے اردو کی جملہ اصناف سخن کے اوزان و بحور پہلے سے موجود تھے اس کے باوجود انھیں خود کو متعارف کرانے میں کہیں کہیں دقتیں پیش آئیں، جیسے غزل اور مثنوی فارسی سے مستعار رہیں، جبکہ قصیدہ عربی سے اردو میں آیا، البتہ مرثیہ جیسے نقادان ادب نے خالص ہندوستانی یا داردو کی صنف اور ایجاد بتایا۔ کیونکہ جس شد و مد کے ساتھ اردو میں پیش کیا گیا، دوسری زبانوں میں اسطرح سے پیش نہیں کیا گیا۔ اسکی ہیئت بہ شکل مسدس، خلیق و ضمیر نے متعین کردی تھی اور انیس و دبیر نے اسی ہیت میں لکھ کر انتہا تک پہنچایا۔ گیت اور دوہے ہندی سے ماخوذ ہیں ان کو بھی اردو کی بحروں میں اور کہیں ہندی کی چھند میں لکھا گیا۔ ثلاثی اردو میں موجود تھی۔ ہاسیکو البتہ جاپانی صنف رہی جسے اردو والوں نے اپنایا۔ نظم کے میدان میں پابند کے علاوہ معرّیٰ، آزاد اور نثری انداز میں لکھی جانے لگیں۔ مگر ماہیا جو خالص پنجابی لوک گیت رہا، جسے اردو اور پنجابی زبان کے شعراء نے گیت یا نغمہ (فلمی نغموں) کے انداز میں

برتا ضرور تھا۔ مگر اس کیلئے بحر اور وزن کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی لے، دھن، ردم اور آوازون کے زیروبم سے تحریر کیا جاتا رہا ہے۔ انھیں دھنوں اور لے کو مدنظر رکھ کر اوزان کا متعین کرنا نیز لکھنے والوں اور قاری کو قائل کروانا یقیناً مشکل اور ادق کام تھا، جسے حیدرقریشی نے بحث وتمحیص کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس بحث کو حیدرقریشی نے پاکستان سے شروع کیا تھا اور جرمنی پہنچ کر مکمل کیا۔ جس میں انھیں پورا سات سال لگے۔ غزل کے متعلق کہا گیا کہ یہ عربی کے قصیدے کی تشبیب سے اخذ کی گئی اور اس کو باقاعدہ ہیئت اور شکل دینے میں ایران والوں یعنی فارسی زبان کو گویا ہفت اقلیم طے کرنا پڑا۔ بعینہٖ حیدرقریشی کو بھی اس لوک روایت کو ادبی شکل دینے میں ہفت سالہ جدوجہد کرنی پڑی، جس میں انھیں طنز وتشنیع کے تیر بھی کھانے پڑے اور صلوٰتیں بھی سنی پڑیں۔ تب کہیں جا کر سخن فہموں اور سخن شناسوں نے اسے قبول کیا۔ میرے نزدیک ماہیئے کی حالت اردو جیسی ہے۔ کیونکہ بقول ماہر لسانیات حافظ محمود خان شیرانی، کہ اردو کا مولد ومسکن پنجاب رہا تو ماہیا بھی پنجاب کی سرزمین ہی سے تعلق رکھنے والا رہا۔ اردو کو بولی سے زبان تک کے سفر میں بڑے پر پیچ و پرخطر راہوں سے گذرنا پڑا تو اس گائی جانی والی روایت (ماہیہ) کو بھی ادبی صنف بننے تک مشکلات اور کٹھنائیوں سے جوجنا پڑا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کیا یہ واقعی ادبی صنف سخن ہے یا نہیں؟ میری نظر میں بقول فانیؔ ؎

ع بستی بسنا کھیل نہیں ہے، بستے بستے بستی ہے

اب چونکہ بیشتر شعراء خواہ وہ پنجاب کے ہوں یا سندھ کے، دکن کے ہوں یا گجرات کے، ہندوپاک کے ہوں یا بیرون ہندوپاک کے، ادب کی اپنی بستیوں کے ہوں یا نئی بستیوں کے ماہیئے لکھ رہے ہیں اور کئی شعراء نے ماہیوں کے مجموعے تک چھاپے ہیں۔ کئی رسائل نے ماہیا نمبر تک شائع کئے ہیں۔ اردو کے نامور نقاد اور اساتذہ نے اپنی آراء پیش کی ہیں تو اب اسے ادبی صنف ماننے میں ہرگز تامل نہیں کرنا چاہئے۔

اس زبانی روایت کو ادبی صنف بنانے میں حیدرقریشی نے باقاعدہ تحریک چلائی۔ انھوں نے پنجابی، اردو، اور فلمی نغموں کے طور پر لکھے جانے والے ماہیوں کا بغور مطالعہ کیا، اس کی تہذہب وتدوین کی اور اوزان کے متعین کرنے میں تحریری بحثیں کیں۔ مضامین لکھے، اعتراضات کے جوابات دیئے، تب کہیں جا کر حسب ذیل اوزان پر اتفاق ہوا۔

۱) مفعول مفاعیلن	۲) فعلن فعلن فعلن
فعل مفاعیلن	فعلن فعلن فع
مفعول مفاعیلن	فعلن فعلن فعلن

(ان کے تحت بننے والے زحافات یعنی ۱۲:۱۰:۱۲، کے وزن میں مستعمل ہوسکتے ہیں)

اب عموماً انھیں اوزان میں ماہیے ملیں گے۔ اس سلسلے میں انہیں مویدین ہی کو نہیں بلکہ مخالفین کو بھی قائل کروانا پڑا، اس میں وہ کبھی ناقدین سے ٹکراتے رہے تو کبھی قاری سے، کبھی تخلیق کاروں سے بھڑتے رہے تو کبھی مدیروں سے اور کبھی کبھی تو ایسی شخصیتوں سے جو بحث برائے بحث کرنے کے عادی تھے۔ غرض ماہیے کا یہ میر کارواں دلائل سے قائل کرواتا ہوا، ظلم کا عفو سے انتقام لیتا ہوا، جہالت کو زائل کرتا ہوا، محاسن ومعائب کو عیاں کرتا ہوا، ماہیے کی اکملیت کو بیان کرتا ہوا ہر مقام و ہر رہ گزر سے کامیاب و کامران گذرتا رہا، بالآخر دنیا کے مختلف گوشوں سے یہ صدائیں بلند ہوئی کہ۔

''اردو میں ماہیا کی نسبت سے آپ (حیدرقریشی) اتھارٹی بن چکے ہیں'' (**ناصر عباس نیر**)

حیدرقریشی کی ان کاوشوں کو سراہتے ہوئے اردو کے نامور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ کہا کہ: ''ماہیا کی ہیئت کی پہچان کرانے کے معاملے میں آپ نے جو خدمات انجام دیں ہیں ان کی ایک تاریخی حیثیت بنتی ہے۔ اردو ادب کا کوئی طالب علم اس سے انکار نہیں کرسکتا''۔

وہیں ایک اور نقاد ڈاکٹر انور سدید نے اس طرح سے اظہار خیال فرمایا ہے کہ

''یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ بعض شعراء نے محض لاعلمی میں ماہیا کے تین مصرعوں کو ہم وزن کردیا تو جناب حیدرقریشی نے اس ''بے شعوری'' غلطی کی طرف نہ صرف توجہ دلائی بلکہ اس غلطی کے استیصال کیلئے تحریک بھی جاری کردی............ کوشیش رنگ لا رہی ہیں اور اب ماہیا اوزان کی صحیح تکنیک میں لکھا جارہا ہے''۔

اس طرح جہاں حیدرقریشی نے ماہیے کو ایک ادبی صنف کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے وہیں ماہیے نے حیدرقریشی کو ادب میں ایک مقام و مرتبہ اور وقار بھی بخشا۔

سطور بالا میں جیسا کہ کہا گیا کہ ماہیا گائی جانے والی نظم ہے۔ اس میں عموماً عشقیہ اظہار ہوا کرتا ہے۔ اور وہ اظہار، فلسفہ کی گتھیوں میں نہیں بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں، دل میں اتر جانے والے انداز میں ہوتا ہے۔ چنانچہ حیدر قریشی نے جہاں اوزان متعین کئے وہیں ماہیئے کے مزاج کی طرف بھی اشارہ کیا کہ ماہیئے کا مزاج کیا ہوگا۔ اس ضمن میں وہ رقمطراز ہیں:

''جہاں تک ماہیے کے مزاج کے مسئلے کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں وزن کی طرح کوئی حتمی اور دوٹوک بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ وزن کو ماہیے کا جسم سمجھ لیں تو مزاج اس کی روح ہے۔ .... حمدیہ، نعتیہ ماہیے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج والے ماہیے۔ بھی پنجابی ماہیے کے اس عمومی مزاج سے بالکل مختلف ہیں۔ جو عام طور پر پنجابی ماہیے کی شناخت ہے۔ جس طرح ماہیے کے مزاج کا زیادہ تر انحصار قاری یا سامع کے ذوق اور مزاج پر ہے ویسے ہی ماہیا نگار کا ذاتی ذوق اور مزاج بھی اس کے ماہیوں میں فطری طور پر آئے گا۔ کوئی نظم نگار شاعر جب ماہیے کہے گا تو ان میں نظم کے اثرات آئیں گے۔ کوئی غزل گو شاعر ماہیے کہے گا تو اس کے ماہیے میں غزل کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ضرور آئیں گے اسی طرح اردو کے گیت نگار اگر ماہیے کہیگا تو گیت کی ہندی روایت بھی اپنا اثر دکھائے گی۔ نظم، غزل، اور گیت کے اثرات اردو ماہیے کے تشخص کو ختم نہیں کریں گے بلکہ اسے تازہ خون فراہم کریں گے۔ ان اثرات سے ماہیے کا مزاج مزید بہتر ہوگا۔''

اتنا ہی نہیں وہ اس کے روشن اور درخشندہ و تابندہ مستقبل سے کس حد تک یقین کامل رکھتے ہیں۔ گویا ایک طرح کی پیش گوئی انھوں نے کی جو چند ہی برسوں میں پوری ہوگئی۔ فرماتے ہیں۔

''ماہیئے کے مزاج کے نام پر اس کے موضوعات کو محدود کر کے اسے تکرار کا شکار بنانے سے بہتر ہے کہ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا کی جائے۔ موضوعات میں وسعت کے باعث اگر بعض نئے تجربہ کچے رہ جائیں یا نامونوس سے لگیں تو انھیں اس لئے برداشت کر لینا چاہئے کہ آگے چل کر ان ادھورے یا کچے تجربات سے نئے اور کامیاب تجربات کی راہیں ضرور نکلیں گی۔ اپنے تمام محبت کرنے والوں اور خوبصورت ماہیا نگاروں کے ساتھ اردو ماہیے کو ایک لمبا سفر کرنا اور ابھی سفر کی ابتداء ہے''۔

یہ ابتداء گویا 90ء کے دہے سے کی اور ان پندرہ سالوں میں بے شمار ماہیا نگار پیدا ہوئے اور آئے دن ادبی جرائد و رسائل میں ماہیے دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں، پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی ماہیے کی دھوم ہے۔

حیدر قریشی کے ماہیے:

ماہیے کا میر کارواں، اس تحریک کا اصل محرک حسن نے تادم تحریر زائد از تین صد ماہیے تحریر کئے ہیں۔ ان ماہیوں میں جہاں پنجاب کی دھرتی کی سوندھی سوندھی بو باس مہکتی ہے وہیں اس مٹی سیا گنے والی گھاس اور پھولوں کی خوشبو اور پھلوں کی رس بھری مہکار محسوس کی جاسکتی ہے۔ سوہنی اور مہیوال کے افسانوں کی روایت جھلکتی ہے، کہی بلھے شاہ اور نانک جیسی خدا ترس ہستیوں کے صوفیانہ کلام کی چاشنی جھلکتی ہے۔ ان میں جہاں جرمنی کی مشینی زندگی بیان ہوئی ہے وہیں تہذیب و تمدن بھی عیاں ہوئی ہے۔ ان کے ماہیوں میں جہاں خدا کے زمرے گائے گئے ہیں وہیں حبیب خدا کی تعریف میں نغمے اور رشتہ داروں پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور کہیں خود پر بیتے ہوئے لمحات و کیفیات پر رائے زنی ملتی ہے۔ ہر ماہیا آزاد ہونے کے باوجود نظم کا سا تسلسل ان میں موجود ہے۔

حیدر قریشی چونکہ ہمہ جہت فنکار ہیں تو یہ ہمہ جہتی ان کے ماہیوں سے مترشح ہوتی ہے۔ کہیں داستانوی رنگ کے ماہیے ملیں گے تو کہیں ڈرامائی اور افسانوی رنگ کے۔ ان میں اپنی دھرتی کے تہوار، میلے ہوں کہ خوشی کی محفلیں، شادی بیاہ کا ذکر ہو کہ رخصتی کا منظر، کہیں موسم کی رنگینیاں ہیں تو کہیں جوانی کی ترنگیں۔ ایسی دھرتی کا ذکر کس قدر سادہ بیانی اور سبک انداز میں وہ کرتے ہیں۔ ماہیا ملاحظہ ہو۔

مکھ دھرتی کا نورانی
جھومر پیڑ اس کے
کھیت اس کی ہیں پیشانی

کیا روپ نکالا ہے
گردن میں اس کی
دریاؤں کی مالا ہے

خوشبو احساس اس کا
رنگت سرخ سفید
اور سبز لباس اس کا

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

ان ماہیوں میں محاکات کا استعمال بہت خوب ہوا ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔ پنجاب کی کھیتیاں، پیڑ، پھول پودے اور ان کی

رنگت کا تک اظہار یعنی محاکات بھی سمعی اور بصری پیکر لئے ہوئے کہ سرخ، سفید، سبز کو حیدر نے احساس کی آنکھوں سے بتادیا اور سماعت کو شنوائی عطا کردی، وہیں پنجاب (پنج +آب) کی مناسبت سے دریاؤں کو مالا کہہ کی واضح کردیا، اور آخری ماہیے میں ایہام کی کیفیت رکھ دی، کہ دھرتی کو محبوبہ بنادیا۔ اب آپ چاہیں تو دھرتی لیں یا محبوبہ، مصرعہ اولیٰ اور مصرعہ ثالث کو مصرعہ ثانی نے جس انداز سے جوڑا اور ربط پیدا کیا۔ واقعی غیر معمولی ہے، غزل کے متعلق نقادانِ ادب نے یہ کہا تھا کہ یہ میناکاری میں ریزہ کاری ہے اور صرف دو مصرعوں میں ساری کیفیت بیان کرنا اور بات کو مکمل کرنا یقیناً صناعی اور مشاقی ہے، اس لحاظ سے ماہیا بڑھ جائے گا، کہ یہاں صرف ڈیڑھ مصرعہ میں بات مکمل کرنی ہے، خیر، غزل، غزل ہے اور ماہیا، ماہیا ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالاسطور میں بتایا گیا کہ حیدر قریشی ایک ہمہ جہت فنکار ہیں، وہ غزل گو بھی ہیں اور نظم گو بھی، اس طرح ماہیا بڑی چابکدستی سے کہہ دیتے ہیں۔ حمد یہ ماہیوں میں بھی ان کی فنکاری جھلکتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ آج کے معاشرے پر بھی ان کی نظر ہے۔ خدا سے دعائیہ کلیمات کا اظہار کرتے ہوئے ترماپ اور کرب کا انداز دیکھئے:

تو خود میں اکیلا ہے	ہمت اور طاقت دے
تیرے دم سے مگر	عہد یزیدی میں
سنسکار کا میلا ہے	شبیری شجاعت دے

نفرت کے اندھیروں کو	دنیا پہ کرم کردے
توڑ مرے مالک	پیار کی سینوں میں
ظلمات کے گھیروں کو	پھر روشنیاں بھر دے

چندر شتے کے عنوان کے تحت لکھے گئے ماہیوں میں الفاظ کا استعمال فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دے رہے ہیں اور شاعرانہ کمال ظاہر کررہے ہیں۔ والد کیلئے برگد کی جٹائیں ماں کی دعاؤں کو نیم شمی شبنم اور چاندنی کی جھانکی کہنا، بیٹوں کو دریا کی روانی اور گذری جوانی سے تعبیر کرنا، پھر شریک سفر کیلئے ؎

اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

کہنا شاعرانہ کمال نہیں تو اور کیا ہے؟ جس میں تخلیق آدم وہوا کا پورا واقعہ سمٹ کر آیا ہے۔ ایسی تلمیحات حیدر قریشی کے یہاں بری سرعت اور سبک روی کے ساتھ آئیں ہیں۔ جوان کی فنکاری کے نمونے ہیں۔

تشبیہات کا استعمال بڑا ہی انوکھا ہے۔ اور ساری تشبیہیں اپنے محل سے جڑی ہوئی ہیں۔ پنجاب کا ذکر ہے تو اس کی مناسبت سے تشبیہوں کا استعمال ہے، اور جرمنی کا جہاں ذکر ہوا وہاں اسی مناست سے اظہار ہوا ہے۔ اس میں بھی کمال کردکھایا ہے۔ اس قسم کی تشبیہیں شاید ہی کسی شاعر کے یہاں آئی ہوں جیسے:

ہونٹ اس کے اناری ہیں	اک خواب ہے جنڈری کا
گال ہیں اس کے یا	اس بھری لڑکی ہے
دو سیب قندھاری ہیں	یا آم ہے سنڈری کا

ان آنکھوں کی مغروری
ہوش اڑا ڈالے
وہ شربت انگوری

ہونٹوں کو انار یا اناری رنگ سے، گالوں کو قندھاری سیبوں سے اور پنجابن کی جوانی کو سندھڑی کے آموں سے تشبیہ شاید ہی کسی شاعر نے استعمال کی ہو۔ یہ کس قدر حقیقی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کا وہ فارمولا جو مقدمہ شعروشاعری میں آپ نے شعر کیلئے ضروری قرار دیا تھا، یعنی سادگی، اصلیت اور جوش، حیدر قریشی کے ماہیوں میں درآیا ہے۔ ان میں سادگی بھی ہے اصلیت بھی اور جوش بھی۔ اس سے کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا۔ یہ اوصاف بیک وقت ''میرے دیہات'' کے تحت لکھے گئے ماہیوں میں بدرجہ اتم موجود ملیں گے۔ منظر نگاری اپنے شباب پر ہے اور منظر بھی سمعی، بصری اور حرکیاتی کیفیت سے لبریز ہے۔ ماہیے دیکھئے: ؎

کھیتوں کے کنارے ہیں	پودے جو کپاس کے ہیں
دور تلک پھیلے	منظر پھولوں کے
فصلوں کے نظارے ہیں	خوشیوں کی آس کے ہیں

چلتے رہے ہل بیلیئے	بور آ گیا آموں میں
محنت والوں کو	رونقیں جاگ اٹھیں

ملتے رہے پھل بلئے　　　دیہات کی شاموں میں

اسی طرح جب جرمنی کا ذکر آیا تو وہاں کی منظر نگاری اسی مناسبت سے اور اظہار خیال میں بھی تبدیلی آئی، وہاں کی تہذیب، برفباری، مشینی زندگی، ان کی دھن، صداقت وغیرہ تمام کیفیات کو جس انداز سے پیش کیا ہے یقیناً دل موہ لیتا ہے۔

مولا کی عنایت تھی
اپنے مقدر میں
جرمن کی ولایت تھی

یورپ کا نگینہ ہے
ابھرا ہوا دیکھو
اس دھرتی کا سینہ ہے

رنگین نظاروں کا
پت جھڑ میں بھی یہاں
منظر ہے بہاروں کا

ٹھنڈک میں ابلتے ہیں
برف پڑے جتنی
جسم اتنے مچلتے ہیں

ایسے دیوانے ہیں
پل بھر کے ساتھی
اور پھر بےگانے ہیں

ہر قوم یہ اچھی ہے
دھن کی بھی پکی
اور قول کی سچی ہے

حیدر قریشی کے ماہیوں میں اکثر تسلسل ملتا ہے جو نظم کا سا انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر ماہیہ اپنی جگہ مکمل بھی ہے۔ خانہ خدا کے تحت حج سے متعلق ماہیئے ہیں جس میں ایک تڑپ، للک اور جذبہ ہے۔ جبکہ نماز عشق کے تحت نماز پنج گانہ اور تہجد پر مبنی چھ ماہیئے ہیں۔

غرض حیدر قریشی کے ماہیوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تشبیہیں انوکھی اور اصلیت پر مبنی ہیں۔ مناسبات لفظی اور تلمیحات کا برمحل استعمال ہے۔ سادگی انتہا کی ہے۔ ان میں جوش بھرا ہوا ہے جو پڑھنے والے کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کا ہنر رکھتا ہے ان کے علاوہ ہندی، انگریزی، جرمن اور پنجابی زبان کے الفاظ سبک روی سے مستعمل نظر آتے ہیں۔ اور کہیں کہیں سندھی اور سرائیکی الفاظ بھی راہ پا گئے ہیں۔ یہ قاری پر گراں نہیں گذرتے بلکہ قاری ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ ایک عمدہ فنکار کی نشانی ہے۔ اس طرح یہ کیا جاسکتا ہے کہ حیدر قریشی بلاشبہ ایک اچھا اور منجھا ہوا ماہیا نگار (فنکار) ہے۔

حیدر قریشی کی تجرید کے کشف کا عذاب

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

تو یہ ہوا کہ کچھ ہی دیر میں لفظوں کی کلیوں سے معنی مہک بن کر اُٹھنے لگے اور مری روح میں چُھپی اُن دراڑوں میں سرایت کرنے لگے جو زماں و مکاں کے بیچ کسی انجانی خلیج کے سبب کُھلی رہ گئی تھیں۔ دھیمے دھیمے خلیج بھرنے لگی اور پھر دونوں جہانوں کے درمیاں ''روشنی کی بشارت'' ہونے لگی اور کچھ ہی لمحوں میں میری نگاہ حیدر قریشی کی اس روشن کہانی کی بشارت دیتی سطروں کی کہکشاں میں چندھیانے لگی:

''میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدت ہے جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل الزوقت نہ ہوگی۔ وہ صفر مدت جب انسان نور کا انکار کر کے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اُس مدت کا انتظار کرنا ہوگا۔''

لمحے بھر میں میرا خیال بیسویں صدی کے پہلے عشرے سے آئین اسٹائین کی اضافی تھیوری کی معنوی تجلیوں سے روشن ہوا اور زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر صدیوں کا فاصلہ طے کر کے چھٹی صدی کی اس آیت کریمہ کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔

'' فرشتے اور روح اُس کی طرف ایک ایسے دن میں صعود کرتے ہیں جس کی گنتی پچاس ہزار سال ہے'' **(المعارج)**

کہانیاں کبھی کبھی چراغ کا بھی تو روپ دھار لیتی ہیں اور پڑھنے والوں کے دلوں کو اس طرح روشن کر دیتی ہیں جس طرح ''روشنی کی بشارت'' کا تخلیق کار اپنی آنکھوں میں سورج لیے اپنی بشارت پر ایمان لانے کو کہتا ہے۔ ایسے میں تخلیق کار زماں و مکاں کے فرق کو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے طے کر کے اپنے قاری کے باطن کا حصہ بن جاتا ہے۔

حیدر قریشی کی ایک اور کہانی ''اپنے وقت سے تھوڑا پہلے'' میں مغرب کی زندگی کے میکانی رویوں میں چھپی وقت کی کھینچا تانی، اپنے اندر موجود نہ

صرف زماں و مکاں کے امکانات کو بلکہ سماجی و خاندانی رشتوں کو بھی بہت ہنرمندی سے نمایاں کرتی ہے۔ اس کہانی کی چند سطریں مکاں و لامکاں کے درمیان کچھ انوکھے انداز سے اُنہیں خود سے ملاتی ہیں:

''لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے، میری مسکراہٹ، حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔ میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لیے اُن کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں لیکن جب اُن کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہ تو میں خود ہوں!''

ٹھیک اس لمحے وہ اپنے قاری اور خود کے درمیاں حائیل فاصلے کو مٹا کر ایک کر دیتے ہیں اور کہانی اپنی معنویت کو وقت کے ملی سیکنڈز سے بھی کم عرصے میں نئی شکل دیدیتی ہے۔

کب تلک چھائی رہے گی یونہی اندھی روشنی
کب تلک حیدر رہیں گے ان اندھیروں کے عذاب

اور جب روشنی ہی اندھیرے کا سبب بن جائے تو تاریک راہوں میں محض ٹٹولتے ہوئے ہاتھ رہ جاتے ہیں اور پھر راستہ محض ڈانسنگ فلور بن کر رہ جاتا ہے جس پہ ہونے والا بے زمین لوگوں کا رقص کسی ماتم کی طرح ذات کے باطن میں تھرکتا ہے۔ یہ وہی شجرِ مجموعہ تھا جس کی خواہش نے حضرتِ آدم کو بہشت بدر کر دیا تھا، آج بھی وہی بے لگام خواہشیں اُس کی بے زمینی کا سبب بن گئی ہیں بس فرق یہ ہے کہ تیسری دنیا کے باسیوں کے پاؤں کے نیچے کی زمین چپکے سے ''بے زمینی'' میں بدل دی گئی اور پہلی دنیا کا بھیک میں دیا گیا گندم بھی ''سرخ گندم'' میں بدل گیا اور اُن کے اندر کا ''میں'' سورج کے نکلنے سے پہلے ہی مر گیا۔ یہی بے زمینی کا کرب جب جغرافیائی حدود سے آگے نکلتا ہے تو تمام تر تاریخی نسبتوں سے ہمکنار ہوتا ہوا ساری کائنات کو خود میں سمیٹ لیتا ہے پھر فرد کا کرب محض اپنی زمین یا نسل کا نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کا غم بن جاتا ہے۔ حیدر قریشی کی کہانی ''اندھی روشنی'' اسی غم کی ایک علامت ہے:

''آج صبح کے اخبارات میں قوم کو یہ نوید سنائی گئی ہے کہ قحط کے خطرے کے پیشِ نظر ایک دوست ملک سے طویل مدت قرض کی بنیاد پر کئی ہزار ٹن گندم خریدنے کے لیے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔

میرے اندر کا ''میں'' سورج نکلنے سے پہلے ہی مر چکا ہے۔

میں پھر اپنی حوا کو ملنے چلا گیا ہوں۔۔ پھر وہی روشنیاں، وہی موسیقی اور وہی رقص ہیں۔۔۔ لیکن ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔، ہم بے زمین ہو گئے ہیں۔ صرف اپنی لاشوں پر کھڑے رقص کر رہے ہیں''

مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رت میں کیسے خواب لگے

یہی غم پھر ''حوا کی تلاش'' میں اپنے اجتماعی رویوں میں ایک انقلابی تبدیلی کا سبب بن جاتا ہے، جب مشرقی و مغربی فتنہ پرور قوتیں ایک دوسرے کو تہس نہس کر کے دنیا کی بربادی کا سبب بن جاتی ہیں اور پھر عالمی ایٹمی جنگ کے بعد بچنے والا مشرق کا فردِ واحد آدم اپنے تمام تر مذہبی اور تہذیبی ورثے کے ساتھ مغرب کی بچی ہوئی فردِ واحد حوا کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ یہاں یہ ''مقدس ملاپ'' رشتوں ناطوں کے روایتی تصور سے بالاتر ہو کر محبت کی اُس عالمگیر فکر کو جلا بخشتا ہے جو مشرق و مغرب کے سنجوگ سے پنپنے والے انسانی معاشرے کی نشاندہی کرتا ہے، جس کی بنیاد میں روحانیت ہی روح کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ حیدر قریشی کہتے ہیں:

''میرے ماضی اور مستقبل کی تحریریں میرے دائیں بائیں ادب سے کھڑی ہیں اور میرا ''برہنہ حال'' میرے برہنہ جسم سے چمٹا مشرق و مغرب کی نفرتوں کو اپنے آنسوؤں سے صاف کر رہا ہے۔

روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اُتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز نکلتی ہے

''۔۔اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے''

راستے تو کھو چکے تھے اپنی ہر پہچان تک
ہم جنازے منزلوں کے خود اُٹھا کر آئیں ہیں

مگر منزلیں جنازے نہیں ہوا کرتیں جب تخلیق کار اپنی تجرید کے کیف آلود لمس سے آگاہ ہو جاتا ہے اور حیدر قریشی نے تو اس کشف کو اوائل جوانی میں ہی پا لیا تھا جب محض اٹھارہ سال کی عمر میں اُن کی تحریریں معیاری ادبی جدیدوں کی زینت بنیں لگیں تھیں اور پھر یہ گیان اظہار کی کئی جہتوں میں ڈھل کر اُن کی داخلی اور خارجی دنیا میں اپنا ادراک دے گیا۔ اُنہوں نے اپنے اظہار کے کینوس پر اپنی تجرید کے اعلیٰ نمونے پینٹ کیے۔ یہ تصویریں کہیں تو غزل، نظم اور ماہیا بن کر

عصر حاضر کی دنیائے ادب میں دلکشی کا سبب بن گئیں تو کہیں افسانہ، خاکہ، سفر نامہ اور انشائیہ بن کر ادبی دنیا کے چار چاند بن گئیں۔ حیدر قریشی کی پوری زندگی کا تخلیقی اثاثہ پچھلے سال ''عمر لا حاصل کا حاصل'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔جس میں اُن کے پانچ شعری مجموعے(سلگتے خواب، عمر گریزاں، محبت کے پھول، دعائے دل، درد سمندر) اور چھ نثری مجموعے (دو افسانوی مجموعے روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں، انشائیے 'فاصلے قربتیں' ، سفر نامہ 'سوئے حجاز' اور خاکوں کے دو مجموعے میری محبتیں اور کھٹی میٹھی یادیں) شامل ہیں۔

حیدر قریشی کی کثیر الجہات ادبی شخصیت کا ایک قابل ذکر پہلو 'جدید ادب' کی ادارت ہے جو آج دیار غیر میں چھپنے والے تمام ادبی رسائل میں سب سے زیادہ معیاری جریدہ ہے۔ادب سے اُن کا یہ مثالی عشق چودہ سال قبل خانپور کی ادبی دنیا میں کسی نوزائیدہ سی کلی کی شکل میں پہلے پہل مہکا تھا اور پھر نو سال کی مسلسل آبیاری کے بعد اب پچھلے پانچ سال سے جرمنی کی غیر ادبی سنگلاخ سرزمین میں اُن کی انتھک محنت کے سبب ایک تناور ادبی شجر کا روپ دھار چکا ہے جس پر کھلنے والے پھولوں کی مہک سے آج ساری اُردو دنیا فیض یاب ہو رہی ہے۔

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی ! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

☆☆ حیدر قریشی کی کہانیوں کی دُنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے، سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے.... انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ وثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔۔حیدر قریشی کی کہانیاں کائناتی انسان، خدا، روح، ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ایسی کہانیاں اُردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔کسی ایک مصنّف کے ہاں ایسی ایک دو کہانیاں نظر آجائیں گی لیکن کوئی ایک ہی مصنّف ان ازلی سوالوں، نظریات اور حسیّات سے جھوجھتا رہے، ایسا کوئی دوسرا کہانی کار میری نظر میں نہیں....حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں۔

دیویندر اسّر

☆☆ حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ ایک بار پڑھنا شروع کیا تو جی چاہا پڑھتی ہی رہوں۔دوسرا اہم وصف بے باکی اور وارفتگی کا ہے جو حیدر قریشی کی شاعری میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ

☆☆ مجھے پہلے کی طرح آپ کے کام کی صلاحیت کے معجزے پر حیرت بھی ہے اور صدر شک بھی۔سمجھ میں نہیں آتا ہے آپ 24 گھنٹوں کو 48 گھنٹوں یا اس سے بھی زیادہ کس طرح بنا لیتے ہیں؟ ۔اگلی ملاقات ہوگی (انشاءاللہ) تو آپ سے یہ منتر سیکھنے کی کوشش کروں گی۔

ڈاکٹر لڈمیلا وسیلئیوا

کھٹی میٹھی یادیں کے تناظر میں

ڈاکٹر لئیق صلاح

ادب میں نثر اور شعر کی مختلف اصناف ہیں۔ ان میں کسی ایک صنف میں درجۂ کمال تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن حیدر قریشی ایک ایسی شخصیت ہے، جن میں کئی ہستیاں یکجا ہوگئی ہیں۔ وہ افسانہ نگار، سوانح، خاکہ نویس، صحافی اور شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے ''میری محبتیں'' کے عنوان سے خاکے لکھے۔ اس کی تکمیل کے بعد موصوف کو خیال ہوا کہ بعض افراد کا ذکر، جتنی تفصیل سے ہونا چاہئے تھا، نہ ہوسکا۔ چنانچہ ان محبوب ہستیوں کے درمیان جو روز و شب گزرے انھیں اپنے ذہن کے نہاں خانے سے کریدا اور کھٹی میٹھی یادیں کے نام سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ اردو ادب میں یوں تو بے شمار سوانح موجود ہیں۔ لیکن جس طرح خطوط میں انسان راز ہائے پنہاں کو اپنے بے تکلف احباب کے آگے بنا کسی تکلف کے پیش کرنے میں جھجکتا نہیں۔ اس طرح خودنوشت سوانح میں وہ بے تکلفی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس یہاں احتیاط کی چھلنی میں چھاننا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کتاب زندگی کے کچھ اوراق چسپاں ہوجاتے ہیں۔ اپنی ''انا'' کی تسکین کی خاطر اچھی باتیں، مبالغہ کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن جن باتوں کے انکشاف سے شخصیت کا بھرم باقی نہ رہنے کا احساس ہو تو بقول غالبؔ ''بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا'' والا معاملہ ہوتا ہے تب پردہ ہائے راز کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ہمارے ادب میں بعض ایسی ''خودنوشت'' بھی ہیں جن کی صداقت پر کم یقین آتا ہے۔ کیونکہ شخصیت کا صرف ایک پہلو جلوہ گر ہوتا ہے۔ حیدر قریشی نے کھٹی میٹھی یادیں کے عنوان ہی سے اس بات کا انکشاف کردیا کہ بیانات صرف ایک جذبے کی ترجمانی نہیں کررہے ہیں۔ بلکہ زندگی کے دونوں پہلوان کے پیش نظر ہیں۔ اس لیے پڑھتے ہوئے یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا، ورنہ قاری اکتاہٹ کا شکار ہوجاتا۔

یہ مختصر سی سوانح ''کھٹی میٹھی یادوں'' کے عنوان سے چالیس سالہ یادداشت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان واقعات کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہیں۔ چالیس سال میں حیدر قریشی کو کتنے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ ان نامساعد حالات سے نمٹنے کے بعد ہوش و حواس کا برقرار رہنا ہی مشکل ہوجاتا ہے۔ قابل تعریف ہے اس کا ذہن جوان یادوں کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اسے یکے بعد دیگر اپنے ذہن کے دریچوں سے نکال کر نہایت شگفتگی اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے بارے میں جس طرح ص۱۶۲۔۱۷۱، اس بات سے آگاہ کیا کہ اس خودنوشت کے بعض واقعات عمر کے اس حصے کے ہیں جسے معصومیت کا دور کہا جاتا ہے یعنی تین یا چار سال کی عمر۔ اس زمانے میں سوائے کھانے پینے اور کھیلنے کے شاید ہی کوئی اور مصروفیت عام طور پر بچوں کو یاد رہتی ہوگی۔ مگر جو غیر معمولی ذہین ہوتے ہیں وہ بظاہر تو عام بچوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ حیدر قریشی ان ہونہار نونہالوں میں سے تھے۔ تب ہی تو وہ واقعات کی پیش کشی میں جزئیات کو بھی فراموش نہیں کرپاتے۔

بچپن کے بعد کا دور نوجوانی کا ہوتا ہے، اس زمانے میں انسان دوڑ دھوپ میں مصروف رہتا ہے۔ حال سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کو سنوارنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اس لیے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ کبھی کبھی بچپن کی کچھ باتیں بھولے بسرے یاد بھی آجاتی ہیں تو انھیں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

جب عہد شباب گزرنے لگتا ہے اور قدم اس کے آگے کی منزل تک بڑھتے بڑھتے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو ایک ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ وہ جس مصروف زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ اور ملازمت کی تگ و دو ختم ہوجاتی ہے۔ تب لیل و نہار کی یکسانیت سے گذرنا پڑتا ہے۔ گہما گہمی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا۔ گزرے ہوئے عرصے میں وقت کی کمی کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اور اب وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ اس وقت انسان اپنے ماضی کی دنیا میں ذہنی سکون کا متلاشی ہوتا ہے ''یاد ماضی'' عذاب نہیں راحت کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

''قصۂ پارینہ'' کی کشش دامن دل کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ جب وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے تو ان کی صاحبزادی (سلمیٰ صدیقی) نے مشورہ دیا کہ وقت گزاری کیلئے T.V. دیکھا کریں تو مولانا نے فرمایا کہ میرا T.V. میرے ساتھ موجود ہے۔ میں اسی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اور وہ ہے اپنے گزرے ہوئے حالات جن میں بطور خاص بچپن کی یادیں سب سے زیادہ پرلطف ہوتی ہیں۔

حیدر قریشی نے ایسی ہی یادوں سے اپنی کھٹی میٹھی زندگی کے واقعات کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ سوانح حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک متوسط خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جن کے ننھالی اور ددھیالی رشتہ داروں میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا تھا۔ ننھال روشن خیال اور ددھیال ترقی سے کوسوں دور۔ خاص بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح حیدر قریشی نے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی، دونوں خاندانوں سے اپنا اٹوٹ رشتہ قائم رکھا۔ خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے ننھال کے مختلف رشتہ داروں کا جہاں ذکر ہے وہیں ددھیال کے عزیزوں کا بیان نام بنام کیا ہے۔ ددھیال والے اپنے حسب نسب، اور پیری مریدی کی روایت کے محافظ محسوس ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنی رشتے کی پھوپھیوں میں بوالال خاتون کا ذکر بڑے پرلطف انداز میں کیا ہے۔ ایک تو پیڈسٹل فین کو جادو یا سحر کا کارنامہ سمجھنا، دوسرا لاہور اسٹیشن پر قلیوں کے غول کو ڈاکو قرار دینا۔ ان واقعات کی پیش کشی سے ایک تو بڑے شہروں سے دور رہنے والوں کی لاعلمی اور معصومیت کا اظہار ہوتا ہے اس کے علاوہ، سوانح کو مزید دلچسپ بنانے میں اس طرح کے بیانات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مثلاً پیڈسٹل فین کے تعلق سے ''یہ کیا اسرار ہے؟ یہ تو کوئی طلسماتی شئے ہے۔ خود بخود کبھی اِس طرف ہوا دینے لگتی ہے۔ کبھی اُس طرف ہوا دینے لگتی ہے''۔

اسی طرح لاہور ریلوے اسٹیشن پر بوالال خاتون کا قلیوں کو ڈاکو سمجھنا:''بوالال خاتون پہلی بار لاہور گئیں۔ ایک تو لاہور ریلوے اسٹیشن کی پر شکوہ عمارت، پھر ہجوم خلق۔ اور اس ہجوم میں سرخ وردی میں ملبوس قلیوں کی فوج ظفر موج۔ اوپر سے قلیوں کا فرط محبت سے سامان اٹھانے میں سبقت لے جانے کی کوشش اور اس کوشش میں سامان کی کھینچا تانی۔ بوالال خاتون نے سمجھا ڈاکوؤں نے ہلہ بول دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بچاؤ۔ بچاؤ۔ کا شور مچادیا''

حیدر قریشی نے بیسویں صدی کی پچاس، ساٹھ کی دہائی کا آنکھوں دیکھا حال بہت ہی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ جب کہ دنیا ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کیلئے کوشاں تھی۔ انہوں نے صحیح نتیجہ اخذ کیا کہ سیدھی سادی زندگی میں جو ذہنی سکون میسر تھا وہ اس ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زندگی میں مفقود ہوتا جارہا ہے۔ اخلاص کم اور نفاق میں زیادتی ہوگئی۔ سرمایہ کی حرص وہوس میں اضافہ ہوگیا۔ اطمینان قلب کی دولت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

کوٹ شہباز کے عام آدمی کی تصویر کشی سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مذہب کی تبلیغ کرنے والوں کی پہنچ صرف شہروں تک محدود ہے۔ گاؤں والے معصوم نہیں جانتے کہ اذان اور کلمہ کیا ہے۔ ایسی صورت میں دین وایمان کی جان کاری کس پر عائد ہوگی۔ ان کے رہنما صرف اپنے عقیدتمندوں کی تعداد میں اضافے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ صحیح راستے کی رہنمائی کرنا وہ اپنا فریضہ نہیں سمجھتے۔

اس سوانح کی دوسری پرکشش تصویر ان رشتہ داروں کی ہے جو قیمتی تحائف نہ سہی بے شمار معمولی اشیاء جن میں کھانے پینے کی چیزیں بھی شامل ہیں، نہایت خلوص سے اپنے عزیزوں کی نذر کرتے ہیں اور لے جانے والے کا حال:

دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے تنگیٔ داماں کی شکایت ہوجائے

کے مصداق ہوتا ہے۔

''کھٹی میٹھی یادیں'' ان رنگ برنگی تصویروں سے مزین ہے جن میں ہر فرد یگانہ ویکتا ہے حیدر قریشی نے بلا کسی خوف وتردد کے حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔ چنانچہ انھوں نے خاندان والوں کی جہاں خوبیاں بیان کی ہیں وہیں خامیوں اور کمزوریوں کی پردہ پوشی نہیں کی۔ حتیٰ کہ اپنا احتساب کرتے ہوئے خود اپنے بارے میں لکھتے ہوئے نہیں ہچکچائے۔ اسی طرح ایک خالہ (سعیدہ) کا شوہر سے علیحدگی اختیار کرنا۔ جس کی بنا پر ان کی لڑکیوں نعیمہ اور صالحہ کی زندگی کا متاثر ہونا، غیر مذہب کے افراد سے رشتہ جڑنا، اپنوں سے ٹوٹ جانا، ماں کی بے وفائی کے سبب پورے خاندان (ننھال) سے نفرت کا مظاہرہ۔ اسی طرح ماموں کوثر کی جھوٹی شان کا ذکر، جس پر حیدر قریشی کو شرمندہ ہونا پڑا۔ اس خامی کے ساتھ، ان کی خوبی کا بیان کہ وہ فضول خرچ ضرور تھے لیکن اپنی مستعدی کی وجہ سے، دوبارہ مالی اعتبار سے مستحکم ہوجاتے تھے۔ ان کی کمزوری کا جواز حیدر قریشی نے بڑے مبہم انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی بیوی (مسز کوثر) اگر قناعت پسند ہوتیں تو ماموں اپنے معیار زندگی کی نمائش کی خاطر اس طرح کی حماقت نہ کرتے۔

حیدر قریشی نے اپنے ننھال کی بعض شخصیتوں کا شعروادب سے لگاؤ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ماموں صادق، ان کی لڑکی سمیرہ اور خالہ حبیبہ کا لڑکا آصف شعر موزوں کرتے تھے۔ ایک اور ماموں ناصر جو حیدر قریشی کے خسر بھی تھے۔ ان کی لڑکی بشریٰ ہما جو سب بہنوں میں چھوٹی تھی وہ بیک وقت شاعرہ بھی

تھی اور گلوکار بھی۔ اس کا اپنا گھرانہ سخت مذہبی ہونے کے باوجود اس نے ٹی وی کی اذان اور آڈیو کیسٹ پر ایک گلوکار کی آواز سے استفادہ کرتے ہوئے اس فن میں کمال حاصل کیا۔

۱۹۶۸ء میں حیدر قریشی میٹرک کرتے ہی شوگر فیکٹری میں ملازم ہوگئے۔ معاشی مسائل کے سبب آگے تعلیم جاری رکھنا دشوار تھا۔ لیکن ان کے اندر کی اُپج ختم نہیں ہوئی تھی ''زنداں میں بھی خیال کی طرح۔ سخت ڈیوٹی اور شفٹ سسٹم میں کام کرنے کے باوجود پوسٹ گریجویشن تک رسائی ہوئی۔ دوسری جانب ڈگری جن مضامین میں حاصل کی تھی وہ روزگار سے متعلق نہیں تھے۔ وہ کس قدر ذہنی اذیت کا شکار رہے۔ اس کا اندازہ وہی بخوبی لگا سکتے ہیں جن کو اس طرح کے حالات کا سابقہ رہا ہو۔ یعنی معمولی قابلیت رکھنے والوں کے ماتحت رہنا، عام مزدوروں کی طرح خدمت انجام دینا، وقتاً فوقتاً مختلف افراد کا ناقابل برداشت برتاؤ، حیدر قریشی ان صبر آزما مرحلوں سے گزرنے کے باوجود حرف شکایت زبان پر نہیں لائے، انھیں کبھی ایسے لوگوں کی کم ظرفی سے سابقہ پڑا، جن کے حقوق کیلئے جدوجہد کی، اور وہ احسان فراموش افراد انھیں دھوکا دے گئے۔

ع ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

حیدر قریشی کی لڑکیوں نے اپنے والد کی کمزوری بتلاتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو بھی قابل معافی قرار دیا کرتے ہیں جنھوں نے بار ہا معذرت خواہی کے بعد انھیں نقصان پہنچایا ہے۔ دراصل یہ ان کی خامی یا کمزوری نہیں بلکہ اس سے ان کی فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کا اظہار ہوتا ہے۔

پاکستان کے سیاسی حالات کا تاثر بھی اس سوانح تذکرے میں موجود ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کے منصوبے کس طرح ایک دوسرے سے مختلف تھے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حیدر قریشی نے مختلف رشتوں کی نشاندہی سرائیکی الفاظ میں کی ہے۔ اس طرح اس دور کے کسی خاص طبقے سے مستعمل لغت کو محفوظ کر دیا۔ موجودہ نسل اپنی تہذیب و معاشرت سے بے گانہ ہوتی جارہی ہے۔ آئندہ وہ اپنی پہچان اور شناخت سے بھی محروم ہوجائے گی اس جامع سوانح میں ان مقامی کھیلوں کا بھی ذکر ہے جو آج نہیں کھیلے جاتے۔ مصنف نے بدلتے ہوئے اقدار پر روشنی ڈالتے ہوئے اس دور کے افراد کے تاثرات کو پیش کیا ہے، جو نسوانی تعلیم، پردہ، ملازمت کے تعلق سے مثبت و منفی نکتۂ نظر کے حامل تھے۔

حیدر قریشی کا ہندوستانی ادباء وشعراء سے غائبانہ تعارف، سرحدوں کی بندشوں سے ماورا اور خلوص سے مملو ہے۔ جن میں قابل ذکر ابن صفی، نذیر فتح پوری، ترنم ریاض اور رؤف خیر ہیں۔ ماریشس کی بین الاقوامی اردو کانفرنس کی روداد پر اس خودنوشت سوانح کا اختتام ہوا ہے۔ یہاں مزید ہندوستانیوں سے شخصی طور پر ملاقات کا موقع ملا۔ جن میں خلیق انجم، ندا فاضلی، شاہد ماہلی، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر امیر عارفی وغیرہ شامل تھے۔

حیدر قریشی نے قبائلی زندگی کے اصولوں اور پابندیوں سے بھی واقف کرایا ہے۔ وہ اپنے اصولوں کے اس قدر پابند ہوتے تھے کہ قبیلے سے باہر کے افراد سے رشتے، ناتے قائم کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ حیدر قریشی نے مغربی ملک جرمنی میں عمر کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود اپنی مشرقیت کو برقرار رکھا ہے۔ عموماً بہت کم لوگ اس طرح اپنی تہذیب سے جڑے رہتے ہیں۔ ورنہ اپنی مشرقیت کو خیر باد کہنا، شان امتیازی قرار پاتا ہے۔

حیدر قریشی اردو زبان وادب سے اپنا رشتہ استوار رکھنے کے ساتھ یہاں کی موسیقی گیت اور غزل سب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ جس کا اظہار انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''پہلا گانا فلم'' خاموشی کا ہے اور اسے لتا جی نے گایا ہے ہم نے دیکھی ہے ان کی آنکھوں کی مہکتی خوشبو

یہ گیت شروع ہوا تو مجھ پر عجیب سا جادو طاری ہوگیا۔ یہ گانا میرے پسندیدہ ترین گانوں میں سے ایک ہے۔ دوسرا گانا بھی لتا جی کا ہے فلم ''انو پما'' سے ''کچھ دل نے کہا۔۔۔ کچھ بھی نہیں''۔

ان کے خودنوشت سوانح سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں دعا مانگتے ہیں قبولیت کا یقین بھی ہے۔ اور مایوسی و ناامیدی کو کفر سمجھتے ہیں۔ تصوف سے بھی واقفیت ہے۔ مسئلہ جبر وقدر کے بارے میں جو تجزیہ انہوں نے کیا ہے وہ بالکل منفرد انداز کا ہے۔ حیدر قریشی احساس کمتری کا شکار نہیں ہیں۔ کیونکہ انھوں نے جرمنی پہنچنے پر اپنے جن تاثرات اظہار کیا ہے۔ ان سے بیوی کی برتری ثابت ہوتی ہے، اور یہ ان کی روشن خیالی و وسیع النظری ہے۔ وہ یار باش آدمی ضرور ہیں لیکن اپنی جیب سے کچھ خرچ کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ ممکن ہے انھیں کسی کا ممنون احسان ہونا گوارا ہے اور نہ کسی کو زیر بار کرنا چاہتے ہیں۔

اس سوانح کا سب سے خاص وصف حیدر قریشی کا اسلوب ہے۔ مختلف موضوعات پر مبنی یہ سوانح ہے۔لیکن کہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ قلم کی روانی میں فرق آیا ہے۔خواہ وہ مل کا حال ہو یا تعلیم و تدریس کا موضوع یا پھر کھیل کا بیان یا دیگر تذکرے۔موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب، طرز ادائے بیان، جن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ان کی تحریر میں بے ساختگی کے علاوہ شگفتگی بھی موجود ہے۔انھوں نے جو واقعات سپرد قلم کئے ہیں وہ طنز و مزاح سے بھر پور ہیں۔دو ایک مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

''سعیدہ کی والدہ کنیز بی بی نے ساری زندگی فلم نہیں دیکھی تھی۔ان کے گھر ٹی۔وی آیا تو ماسی کنیز نے ٹی۔وی پر مردوں کو دیکھ کر پردہ کرلیا تا کہ ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے مرد انہیں بے پردہ نہ دیکھیں۔''

طالب علموں کے تعلق سے لکھا ہے۔

''بعض جملے جان بوجھ کر غلط بناتے تھے۔جو غلط ہو کر بھی با معنی ہوتے تھے۔اوران سے جملہ بنانے والے کی ذہانت عیاں ہوتی تھی۔

پیٹھ پیچھے برائی کرنا: کسی کے پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔اور ایڈز کی بیماری بھی ہو جاتی ہے۔

مت ماری جانا: ڈاکو نے اپنی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تم مفت میں میرے ساتھ مت ماری جانا۔''

ایک موقعہ پر سائنس کے کسی استاد نے ''داشتہ آید بہ کار'' کا مطلب پوچھا تو ایک ذہین طیب صاحب نے کہا پوری مثل یوں ہے ''اہلیہ آید بہ تانگہ، داشتہ آید بہ کار'' اور مطلب بالکل واضح ہے۔ ۱۷۴

اس سوانح کے کردار، خاکہ نگاری کی شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ مطالعے کے دوران کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس شخص کو متعارف کرایا جا رہا ہے وہ پس پشت ہے اور حیدر قریشی ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔بعض سوانح نگار اور خاکہ نگار سمجھتے ہیں کہ ان کی جھلک زیادہ نظر آئے یہی سوانح نگاری و خاکہ نگاری کا سب سے بڑا نقص ہے۔آپ اپنی تصویروں کو ابھاریے، ان کا حسن ہی مصور کی ناموری اور شہرت کا باعث ہوگا۔پس پردہ رہ کر بھی سونح نگار اور خاکہ نگا کی شخصیت اپنا جلوہ کامیابی کے ساتھ دکھا سکے گی۔یہ صفت حیدر قریشی کے خاکوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

(ڈاکٹر لئیق صلاح سابق پروفیسر و صدر شعبہ اردو۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ)

حیدر قریشی بحیثیت کالم نگار

نعیم الرحمٰن (ARY چینل۔کراچی)

حیدر قریشی ایک صاحب طرز اور ہمہ جہت شاعر و ادیب ہیں۔نثر اور شعر کی کم و بیش تمام اصناف ادب میں اپنے قلم کا لوہا منوا چکے ہیں اور اپنی تحریروں پر ناقدین فن سے بھر پور داد حاصل کی ہے۔شاعری میں نظم، غزل کے ساتھ اردو ماہیا کو مقبول بنانے میں حیدر قریشی نے اپنے تخلیقی جوہر کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔نثری ادب کو بھی افسانہ، انشائیہ، خاکہ، تنقید اور یادوں کی باز آفرینی کے ذریعے مسلسل مالا مال کر رہے ہیں اور ان تمام ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ''جدید ادب'' کے مدیر کی حیثیت سے جرمنی میں اردو ادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔

شاعر و ادیب حیدر قریشی کسی شعوری عمل کے بجائے کالم نگاری کی جانب حادثاتی طور پر آئے اور اس شعبے میں بھی اپنے نقش ثبت کرنے میں کامیاب ہوئے۔نائن الیون کے سانحے نے جہاں عالمی سیاست کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔حیدر قریشی کو بھی اپنا نقطۂ نظر بہ انداز دگر پیش کرنے پر مجبور کر دیا۔اپنی کالم نگاری کے حوالے سے کالموں کے مجموعے ''منظر اور پس منظر'' کے ابتدائیے میں خود حیدر قریشی رقم طراز ہیں'' گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد عالمی سیاسی اخلاقیات اور اصولوں کی دنیا کا نقشہ جس سرعت کے ساتھ تبدیل ہوا، اس پر باقی دنیا کی طرح میں بھی عجیب سے دکھ اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔شاعری یا کہانی کی صورت میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو جو کچھ لکھا گیا وہ میرے نزدیک صحافتی سطح کی شاعری اور اسی سطح کے افسانے بنتے تھے۔میں نے دو نظمیں اور تین افسانے لکھ تو لئے لیکن میری ان نظموں اور کہانیوں نے ہی مجھے روک لیا۔صحافت کا اپنا ایک جہان ہے، جو ادب سے قربت رکھنے کے باوجود بالکل الگ جہان ہے ۔میں ادب اور صحافت میں پیش کش کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں۔اسی لئے صحافیانہ انداز میں کہانیاں لکھنے والوں کی طرح اپنی کہانیاں پیش کر کے میں اس موضوع، اس انسانی اور عالمی سیاسی المیہ پر اپنے جذبات کا پورے طور

پر اظہار نہیں کر پاتا۔ بے شک بعض بڑے افسانہ نگاروں نے بعض ہنگامی موضوعات کو مس کر کے بھی بڑی بڑی کہانیاں لکھی ہیں لیکن میری لکھی کہانیاں مجھے ادبی تقاضوں سے ہٹ کر سطحی ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ چنانچہ ان کہانیوں اور نظموں کے کہنے پر میں نے ان سب کو ضائع کر دیا۔

باخبری کتنی بڑی نعمت اور کتنا بڑا عذاب ہے؟ مجھے ہمیشہ سے اس کا احساس رہا ہے کیونکہ میں اخبارات کا مستقل قاری ہوں۔ اپنے اردگرد سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ پھر نائن الیون کے بعد جو قیامتیں گزری ہیں، ان سے کیسے بے خبر یا بےتعلق رہ سکتا تھا! میں عالمی اور ملکی صورتحال پر مختلف انداز سے غور کرنے اور اسے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سمجھنے کے نتیجہ میں مختلف ذہنی کیفیتوں سے گزرتا رہا۔ اسی عرصہ میں نائن الیون کے سانحہ کو چھ ماہ گزر گئے۔

اور پھر وہ ۲۳/مارچ ۲۰۰۲ء کا دن تھا۔ جب میں اسی گومگو ، بےچینی اور کرب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ عالمی صورتحال سے لے کر علاقائی اور ملکی صورتحال تک جو کچھ دکھائی دے رہا تھا اس سب سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسی بےیقینی، بےبسی اور دکھ کی حالت میں کوئی نظم یا کہانی لکھنے کے بجائے حالاتِ حاضرہ پر براہِ راست لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور اسی دن میں نے ایک آرٹیکل لکھا جس کا عنوان رکھا ''ہماری اجتماعی غلطیاں''۔۔۔ پھر اسی دن شام کو ایک اور آرٹیکل لکھا۔ ''اختلافِ عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں؟''

صحافت اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اردو کے نامور مشاہیر ادیب و شعراء مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالحلیم شرر، محمد علی جوہر سے چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، سبطِ حسن اور فیض احمد فیض نے میدان صحافت میں بھی جھنڈے گاڑے اور جن کے نقوش قدم پر چلنا آج کے صحافی باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود صحافت کو ادب سے کمتر قرار دیا جاتا ہے۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ادب کا ایک آفاقی مقام ہے اور اعلیٰ ادب وقت اور مقام کی قید سے ماورا ہوتا ہے۔ اسکے برعکس صحافت کی زندگی محض ایک روزہ ہوتی ہے۔ آج کا اخبار ایک روز بعد ہی باسی قرار پاتا ہے اور دور حاضر کے الیکٹرک میڈیا پر توٹی وی چینل کا ایک تازہ ''ٹکر'' کچھ دیر قبل کے خبر نامے کو پس منظر میں ڈال دیتا ہے۔ تاہم کالم نگاری کو بجا طور پر ادب اور صحافت کی درمیانی کڑی سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک خبر نگار کے مقابلے میں کالم نگار کیلئے وسیع مطالعہ، تاریخی شعور، خبر کے پس منظر سے آگاہ اور پیش بینی کا حامل ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کالم نگار وقتی مصلحت کے تحت خبروں میں چھپائے گئے حقائق اور سربستہ رازوں کی پردہ کشائی کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے اور انکا تجزیہ کر کے مسائل کے حل کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ ادبی چاشنی بھی کسی کالم کو جاندار بنانے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اسی بنا پر اخبار کی زندگی کے برخلاف اچھا کالم ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ظہیر بابر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مشفق خواجہ، مستنصر حسین تارڑ، امجد اسلام امجد اور ظفر اقبال کے بعد حالیہ دور میں جاوید چوہدری، اوریا مقبول جان، عرفان صدیقی، ہارون رشید اور رؤف کلاسرا کے کالم نہ صرف دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر کے مجموعے بھی بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ہمیشہ زندہ رہنے والے کالموں نے کالم کو بھی ایک صنف ادب کا مقام دیدیا ہے۔

حیدر قریشی نے کالم نگاری میں نہ افسانوی انداز اختیار کیا ہے نہ وہ اپنے قاری کو اعداد و شمار کی بھول بھلیوں میں الجھاتے ہیں بلکہ وہ بے لاگ انداز میں تازہ ترین حالات و واقعات کا تجزیہ ہی سیاق و سباق کے ساتھ پیش نہیں کرتے بلکہ ان مسائل کے حل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست اور عالمی صورتحال پر حیدر قریشی کی گہری نظر ہے اور جرمنی میں رہتے ہوئے وہ پاکستان اور برصغیر کی روز بروز رنگ بدلتے سیاسی، مذہبی اور معاشی حالات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں انہی چیزوں نے حیدر قریشی کو کالم نگاری میں ایک انفرادیت عطا کی ہے۔

حیدر قریشی ایک رجائیت پسند انسان ہیں اور وہ ہمیشہ امید کا دامن تھامے رہتے ہیں اسی لئے کالم نگاری کے آغاز پر وہ پرویز مشرف کے پاکستان کے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے پر بھی خوش امید نظر آتے ہیں لیکن انکی یہ امیدیں سراب ثابت ہوئیں۔ چنانچہ منظر اور پس منظر کا انتساب پرویز مشرف کے نام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جنہوں نے بالکل جائز بنیاد پر ملک کا اقتدار سنبھالا، جنہوں نے یکا یک بدلتے ہوئے عالمی حالات میں بہت سے ناگوار سہی مگر بروقت اور درست فیصلے کئے، جنہوں نے اقتصادی لحاظ سے ڈوبتے ہوئے ملک کو کسی طرح سہی، اقتصادی زبان میں سنبھالا دیا، **لیکن** جنہوں نے اندرون ملک، قومی دولت لوٹنے والوں سے کسی سیاسی امتیاز کے بغیر ملک کی دولت واپس لانے کا سب سے اہم اور بنیادی فرض فراموش کر دیا ہے، اور جو

اپنی سیاسی مجبوریوں کے باعث بہت سے بڑے چوروں کا سیاسی تعاون حاصل کرنے کے لئے انہیں اپنے سیاسی سیٹ اپ میں حصہ دار بنائے بیٹھے ہیں۔''

پرویز مشرف سے اچھی امید وابستہ کرتے وقت حیدر قریشی جیسے وسیع المطالعہ شخص نے یہ تاریخی حقیقت نظر انداز کر دی کہ دنیا کے کسی ملک نے فوجی آمر کے زیر سایہ ترقی نہیں کی اور فوجی جنرل ہمیشہ عرب کے روایتی اونٹ کی مانند ہوتا ہے جو ایک بار سر اندر کرنے کے بعد نہ صرف پورے خیمے پر قابض ہو جاتا ہے بلکہ مالک کو بھی نکال باہر کرتا ہے۔ پاکستان میں بھی ہر فوجی آمر نے اقتدار سنبھالنے کے جواز تراشے اور اسکے بعد خود ساختہ نجات دہندہ بن بیٹھا، انہیں اپنے غیر قانونی اقتدار کو عوامی رنگ دینے کیلئے کاسہ لیس اور کرپٹ سیاست دانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے سیاست دانوں کی کبھی کمی نہیں رہی جو آمریت کی چھتری تلے ہی پنپ سکتے ہیں اور آمریت کے سایے میں ہی انکے سیاہ کارناموں پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اسی لئے ایوب سے لیکر یحیٰی، ضیا اور پرویز مشرف ہر جنرل کو اپنی اپنی ق لیگ مل ہی جاتی ہے جو وردی میں دس مرتبہ منتخب کرانے کا دعویٰ کرتے ذرا نہیں شرماتے۔ حیدر قریشی حقیقت پسند انسان ہیں اسی لئے جلد اس سراب سے باہر آ گئے اور انہوں نے اپنے ابتدائی تجزیوں کے برعکس لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

حیدر قریشی کے موضوعات متنوع ہیں اور سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اپنے پہلے کالم ''ہماری اجتماعی غلطیاں'' میں انہوں نے عالم اسلام کے امریکا کے ہاتھوں استعمال ہونے اور امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور بنانے میں مسلم ممالک کے کردار کو واضح کیا ہے کہ کس طرح کمیونزم دشمنی اور جہاد افغانستان کے نام پر عالم اسلام امریکا کا آلۂ کار بنا اور اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو کس طرح غدار اور ملک و اسلام دشمن قرار دیا گیا۔ کالم کا اختتام حیدر قریشی نے ان الفاظ پر کیا کہ ان غلطیوں کی تلافی تو ممکن نہیں لیکن اب ہمیں امریکی شکنجے میں رہتے ہوئے اپنے ان حوال کو درست کرنے پر توجہ دینا چاہئے جن پر پہلے توجہ نہیں دے سکے تھے۔ اس طرح اپنے پہلے ہی کالم میں حیدر قریشی نے محض مسئلہ پر بحث نہیں کی بلکہ مستقبل میں اسکے حل کی جانب بھی اشارہ کیا۔

''اختلاف عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں۔'' ایک اہم موضوع پر لکھا گیا کالم ہے جس میں منیر انکوائری کمیشن کے سامنے مولانا مودودی کے اس بیان کے حوالے سے علماء کے کردار واضح کیا گیا ہے جس میں مودودی نے کہا تھا کہ ''اگر بھارت میں ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ شودروں جیسا سلوک کرے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں''۔ اسی طرح جنرل ضیاالحق کے دور میں مذہبی دہشت گردی کے فروغ، ایم کیو ایم جیسی فاشست تنظیم کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے ملک میں شیعہ سنی فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا، ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کو فروغ حاصل ہوا۔ کالم میں حیدر قریشی نے ان تمام تفصیلات کے بعد بتایا کہ برصغیر میں اسلام کا فروغ بادشاہوں اور انتہا پسند علماء کے ذریعے نہیں بلکہ محبت کا درس دینے والے ولیوں اور صوفیوں کے ذریعے ہوا، آج بھی ہندو، سکھ اور دیگر مذاہب کو ماننے والے ان بزرگان دین سے عقیدت رکھتے ہیں وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقے حکمرانوں کی بے حسی کو نظر انداز کر کے باہمی نفرتوں کا خاتمہ کرنے اور محبت کے فروغ کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔

مغرب اور مشرق کے تناظر میں لکھے کالم میں حیدر قریشی نے تحریر کیا کہ یورپ و امریکا میں عوام خود اپنے مذہب کی پابندی معاشرتی ضرورت سے زیادہ کرنا پسند نہیں کرتے اور جن لوگوں نے اپنے قابل احترام پوپ کو کونے میں بٹھا دیا ہو، کسی مذہب کی طالبان جیسی سختی انہیں خوفزدہ کر دیتی ہے۔ سوویت یونین کی تباہی نے بھی انہیں اسلام سے خوفزدہ کیا ہے دوسری جانب امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفادات بھی انہیں اسلامی خطوں سے وابستہ ہیں چنانچہ مغربی میڈیا نے ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا ہوا کھڑا کر دیا۔ طالبان نے اگر اسلام کی من مانی تشریح کے حوالے سے فاش غلطیاں نہ کی ہوتیں افغانستان کو تباہی سے بچایا جا سکتا تھا۔ بش کی جانب سے تہذیبوں کے ٹکراؤ کے بیان کے حوالے سے کالم میں حیدر قریشی نے لکھا کہ افغان سرزمین اور عوام پر جہنم کا دہانہ کھولنا تہذیبوں کا ٹکراؤ یا صلیبی جنگ نہیں اور اگر ایسا ہے بھی تو تمامتر تباہ کاریوں کے باوجود یہ جنگ ہارنے کا امکان زیادہ ہے حیدر قریشی کی پانچ سال قبل کی پیش گوئی آج حقیقت نظر آ رہی ہے جس سے کالم نگار کے وژن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں بیرونی حملہ آور قرار دینے اور یہودیوں کو بے گھر کرنے کے نام نہاد دعووں کی قلعی کھولنے کے ساتھ اپنے کالم میں حیدر قریشی امریکا کی ہمدردی کا پردہ اس طرح چاک کرتے ہیں اگر ان اصولوں پر ہندوستان اور اسرائیل کو مسلمانوں سے پاک کرنا درست ہے تو پھر امریکا اپنے ملک کے اصل باشندوں ریڈ انڈینز کی بھی دادرسی کرے۔

ایک اور کالم ''اتنا ظلم مت کیجئے'' میں حیدر قریشی گودھرا اسٹیشن کے سانحے

کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ امریکا اور بھارت اگرچہ مذہبی تعصب سے انکار کرتے ہیں لیکن امریکا، بھارت اور اسرائیل کا براہ راست نشانہ مسلمان ہی ہیں اور یہ ممالک اسی طرح نسل پرستی کے زعم میں مبتلا ہیں جیسے ہٹلر تھا۔ترقی یافتہ مہذب دنیا کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں کے پرکھوں کی مبینہ کردہ اور ناکردہ زیادتیوں کی سزا آج کے مسلمانوں کو نہ دیں سابقہ زمانوں کے حساب میں پڑے تو سب کے ذمے بہت کچھ واجب الادا نکلے گا اور آج کا دور بھی کبھی سابقہ زمانوں میں شمار ہوگا۔اسی طرح حیدر قریشی کے ہر کالم میں مثبت پیغام مضمر ہیں۔

''ٹریڈ سینٹر پر اصل حملہ آور کون؟''''جہاد اور بعض اہم مذاہب کی تعلیمات''''امریکا،ایشیا اور جنوبی ایشیا''''امریکا اور ہم''اور''فلسطینیوں کیلئے جانوروں جتنے حقوق کی اپیل''جیسے کالموں کے عنوان ہی سے انکی حساسیت اور صاحب تحریر کی دردمندی عیاں ہے۔حیدر قریشی نے اپنے ہر موضوع کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور تاریخی حوالوں سے انکا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے انسانوں کیلئے ایک مثالی دنیا کا خواب دیکھا اور اپنے قارئین کو دکھایا ہے۔حیدر قریشی کا دردمند دل مختاراں مائی پر ہونے والے ظلم پر تڑپ اٹھتا ہے او روہ خود ہی خون کے آنسو نہیں روتے پڑھنے والوں کو بھی رونے کی دعوت دیتے ہیں لیکن دراصل یہ رونے کی دعوت نہیں بلکہ ان ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت ہے۔

''پرویز مشرف اور پاکستان''کالم کا آغاز ہی میں حیدر قریشی نے لکھا ہے کہ میں پرویز مشرف کے مداحوں میں تھا۔ان الفاظ سے پہلی بار مجھے حیدر قریشی تاریخی شعور سے عاری نظر آئے لیکن جلد ہی انکی آنکھیں کھل گئیں اور بقیہ کالم امیدوں کے ٹوٹنے کا نوحہ بن گیا لیکن حیران کن طور پر اختتامی الفاظ میں حیدر قریشی نئی امیدوں کے سراب میں گھرے
نظر آتے ہیں اور پرویز مشرف کو اصل مسائل پر توجہ دینے اور درست ترجیحات کے تعین کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوا تو آپ بھی سابقہ فوجی تسلسل کا حصہ ہیں اور تعمیر نو بیورو لٹی پٹی قوم کو مزید لوٹنے کے کھیل کے سوا کچھ نہیں گویا ابھی فوجی جنتا کے کردار میں شک وشبہ کی گنجائش ہے۔

مسائل اور حالات کے درست اور بروقت ادراک میں حیدر قریشی کو ملکہ حاصل ہے۔اپنے کئی کالموں میں انہوں نے مشاہدے کی بنیاد پر مستقل بنی کا عمدہ مظاہرہ کیا ہے اور انہوں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جو مشورے دیئے انکی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور حیدر قریشی کا ذکر کئے بغیر انکے موضوعات اور مشوروں کا ذکر مشاہد حسین اور بے نظیر بھٹو نے کیا جبکہ اے آر وائی کے نامور تجزیہ نگار ڈاکٹر شاہد مسعود نے ان سے استفادہ کیا ہے جو حیدر قریشی کی کامیابی کی دلیل ہے۔منظر اور پس منظر کتاب میں شامل تمام کالموں کا ذکر کیا جائے تو یہ مضمون بہت طوالت اختیار کرلے گا۔۔

پچیس کالموں کے بعد حیدر قریشی نے عارضی طور پر کالم نگاری ترک کردی لیکن پھر احباب کے پرزور اصرار پر انہیں دوبارہ اس جانب آنا پڑا،اس بار انہوں نے نہلے پہ دہلا کے عنوان سے خبروں پر فکاہیہ تبصرے شروع کئے انکے یہ کالم بھی خبرنامہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔کالموں میں خبروں پر ہلکے پھلکے تبصرے ماضی میں بھی کافی مقبول رہے ہیں لیکن عام طور پر اس قسم کے کالم وقتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔لیکن جیسا کے خبرنامہ کے پیش لفظ میں حیدر قریشی نے لکھا کہ زمانی قید کے باوجود کئی خبریں تازگی کا احساس دلاتی ہیں۔ہمارے عالمی،مذہبی،علاقائی،مقامی ،سیاسی اورمعاشرتی رویوں کے دلچسپ اورالمناک پہلوؤں کوسامنے لاتی ہیں۔خبروں پر مبنی تبصروں پر مبنی کالموں میں ہماری ماضی قریب کی تاریخ کے چند مضحکہ خیز پہلو،سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کے بیانات میں تضاد،جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کی دلچسپ کوششیں سامنے آتی ہیں اور چند برس پرانی ہونے کے باوجود انکی دلچسپی قائم ہے اور اسی پس منظر میں قاری کے علم میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔

گذشتہ برس کے آغاز میں حیدر قریشی نے کالموں کے نئے سلسلے''اِدھر اُدھر سے''کا آغاز کیا۔طویل کالموں کے اس سلسلے کا کینوس قدرے وسیع تھا۔اس سلسلے کے اپنے پہلے کالم میں انہوں نے عیدالاضحیٰ کے دن صدام حسین کو پھانسی دینے پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔حیدر قریشی نے اپنے ہی عوام پر طاقت کے بے رحم استعمال،ظلم وجبر پر قائم حکمرانی اور ایران سے بے مقصد جنگ کے حوالے سے صدام حسین کے منفی کردار کو بھی اجاگر کیا اور انکی جذباتی حمایت سے گریز کیا جسکا مظاہرہ اکثر مسلمان لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں۔اسی کالم میں حمید گل کے آئی جے آئی بنانے کے منفی کردار اور بھٹو کے عدالتی قتل کی بھی مذمت کی ہے۔

اگلے کالم میں مذہب کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کے حوالے

سے پرویز مشرف کی قیادت میں صوفی کونسل کے قیام کا پردہ چاک کیا اور اس میں الطاف حسین کے پیر بننے کے ڈھونگ اور چودھری شجاعت کے مذہب کا نام استعمال کرنے اور سوویت یونین کے خلاف جہاد کے نام پر مسلمانوں کو بے وقوف بنانے حقیقت دلنشین انداز میں بیان کی یہ چشم کشا تحریر حیدر قریشی کی موضوع پر گرفت کی آئینہ دار ہے۔اپنے ایک اور کالم میں حیدر قریشی نے اسرائیل کے صدر موشے کیٔسان پر جنسی جرائم پر فرد جرم عائد کئے جانے، اسرائیلی چیف آف اسٹاف کیخلاف کرپشن ثابت ہونے اور وزیر اعظم کے خلاف تحقیقات کو اسرائیل میں قانون اور انصاف کی سر بلندی قرار دیتے ہوئے پاکستان میں یحیٰی خان کے جنسی اسکینڈلز سے مجرمانہ چشم پوشی کو ملک کے دولخت ہونے کی ایک وجہ قرار دیا۔ایک اور کالم میں گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا دولکھاوٹ'' کو موضوع بناتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر کو اس موضوع پر حرف آخر قرار دیا۔اگلے کالم میں ویلنٹائن ڈے کی تاریخ بیان کی ہے اسی کالم میں بگلیہار ڈیم پر عالمی عدالت کے فیصلے کو پاکستان اور بھارت دونوں کی حکومتوں کی جانب سے کامیابی کے دعووں کا ذکر کیا ہے۔

کراچی میں بارہ مئی کی خونریزی پر حیدر قریشی جو جذباتی انداز اختیار کرنے سے گریز کرتے ہیں اپنے جذبات چھپا نہیں سکے اور انہوں نے کھل کر ایم کیو ایم کے فاشسٹ کردار کو واضح کیا اور خونریزی کے بعد مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے اور چیف جسٹس کیخلاف زہر اگلنے کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے اور حقیقی احتساب کی ضرورت پر زور دیا اپنے اگلے کالم میں بھی حیدر قریشی نے ایم کیو ایم مہاجر قومی موومنٹ کہلانے کے دور کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ کس طرح یہ تنظیم ایجنسیوں نے بنائی اور یہ ہمیشہ ایجنسیوں کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی۔بارہ مئی کے واقعات سے کس طرح پارٹی کا ووٹ بینک خصوصاً اسٹیل مل میں متاثر ہوا پھر کراچی میں اس خونریزی کے دوران اسلام آباد میں صدر مشرف کے جلسے میں سفاکانہ ڈھولک رقص اور قوت کے اظہار کے دعوے پر حکومت کو آئینہ دکھایا چیف جسٹس کے خلاف ایم کیو ایم کی لچر زبان پر گھن کا بھی اظہار کیا۔

جون کے ایک دلچسپ اور چشم کشا کالم میں حیدر قریشی نے تحریر کے بجائے تصویر کا سہارا لیا اور عالم پناہ، ظل الٰہی، شہنشاہ پاکستان کے زیر تعمیر محل کی تصاویر کے ذریعے انہوں نے ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' کے مصداق بہت کچھ بیان کر دیا اور اپنی باخبری سے بھی پاکستانی حلقوں کو حیران کیا یہ تصاویر سرے اور رائے ونڈ محلات کے برسوں سے جاری پروپیگنڈے کی حقیقت بھی عیاں کرتی ہیں۔

حیدر قریشی کا ایک یادگار کالم لال مسجد کے ڈرامے کے ڈراپ سین پر لکھا گیا۔لال مسجد کے حوالے سے پاکستان کے عوام دو انتہاؤں پر ہیں کچھ لوگ لال مسجد آپریشن کو طاقت کا وحشیانہ استعمال اور ظلم و جبر سمجھتے ہیں دوسرے لوگ حکومت کی تمام کارروائیوں کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔اسکے برعکس حیدر قریشی نے جہاں آپریشن کو درست قرار دیا وہیں غازی برادران کے حوالے سے ماضی میں حکومت کی مجرمانہ چشم پوشی کو واضح کیا۔عبدالرشید غازی کے انیس سو چوراسی میں اسلحہ کے ساتھ پکڑے جانے اور چھوڑنے، اٹھانوے میں انکے والد عبداللہ کے قتل کے بعد کی صورتحال کے بعد غازی برادران کی سرگرمیوں اور ریاست کے اندر ریاست قائم کرنے پر حکومت کے نوٹس نہ لینے پر اسے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔اسی کالم میں حیدر قریشی نے قیام پاکستان پر پاکستان اور قائداعظم کے بارے میں مذہبی لیڈروں اور علماء کے انتہائی مذموم اور بیہودہ بیانات کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کا کردار واضح کیا ہے۔

تیس دسمبر دو ہزار سات کو اپنے آخری کالم میں حیدر قریشی نے بے نظیر بھٹو کی شہادت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر القاعدہ کو بے نظیر کو نشانہ بنانا ہوتا تو وہ برطانیہ اور یو اے ای میں زیادہ آسان تھا۔یہ ایجنسیوں کا کام ہے جنہوں نے کارساز میں ناکامی کے بعد بہتر منصوبہ بندی کی اور خودکش حملے سے قبل فائرنگ کر کے مقصد حاصل کر لیا۔سازش کے تانے بانے اعجاز شاہ اور بعض فوجی افسران سے ملتے ہیں جو غالباً پرویز مشرف کو بھی ہٹانا چاہتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمنوا جنرلوں کے ساتھ پرویز مشرف خود اس جرم کے محرک اور سرپرست ہیں۔اس طرح گجرات کے چوہدریوں کے دل کا کانٹا نکل گیا۔اسی روز نواز شریف کے جلسے پر بھی فائرنگ ہوئی۔سال کے آخر میں آنے والی خبر کے حوالے سے انہوں نے لکھا کہ چھ سال میں پانچ بینکوں کے حکومت نے ایک کھرب اور چھ ارب روپے کے قرضے معاف کرائے جو مشرف دور کی کرپشن کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔شوکت عزیز کے وائٹ کالر کرائم کا بھی کچا چٹھا کھولا گیا ہے۔فوج، میڈیا اور عدلیہ کی کرپشن کی ریٹنگ کا بھی اسی کالم میں بیان ہے حیدر قریشی نے ایران کی جرات، دانشمندی اور سفارتی طریقوں سے امریکا کے مقابلے کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔حیدر قریشی کے اس کالم کا سب سے اہم

حصہ ''لیزاجنرل'' رپورٹ میں مسلمان ممالک کے نئے نقشے کی اشاعت ہے جس میں افغانستان اور پاکستان کے ٹکڑے کرنے کے منصوبے کا انکشاف ہے۔ اس منصوبے کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے اور عالم اسلام کو اپنے اتحاد سے اس خطرے کا تدارک کرنا نہایت ضروری ہے۔ حیدر قریشی نے امریکی مفادات کیلئے کام کرنے کے بجائے اپنے عوام کو تعلیم، روزگار، صحت اور جمہوریت فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ان تمام کالموں سے واضح ہے کہ حیدر قریشی ایک دردمند دل کے مالک حساس انسان اور بے باک کالم نگار ہیں انہوں نے کالم نگار کی حیثیت سے عالم اسلام کے مسائل اور پریشانیوں کے تجزیے کے ساتھ انکے حل کی بھی نشاندہی کی ہے اور کالم نگار کی حیثیت سے بھی اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ اس شعبے میں ان کے مقام کا تعین تو مستقبل کا مورخ ہی کریگا۔

(مصنف کراچی میں مقیم اور ARY چینل سے وابستہ ہیں)

☆☆ حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔ حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لئے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے اور یوں وہ مطالعہ کو بے تامل اپنی مرضی اور خواہش سے گھٹاتے بڑھاتے گویا اس کے بارے میں پڑھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنے معمول کے دوران اس سے عین مین مل کر اپنے نتائج اخذ کر رہا ہوتا ہے۔ **جوگندر پال**

☆☆ انہوں نے اپنے غزلیہ اشعار کے وسیلے سے نامعلوم خلاؤں میں محض الفاظ و خیالات کے طوطا مینا اڑانے کے بجائے زندگی کی رگوں میں دوڑنے پھرنے والے زندگی کی اوبڑ کھابڑ سطح پر رواں دواں تلخ و ترش اور کھٹے میٹھے حقائق کی اثر انگیز ترجمانی کی ہے۔ انہیں دنیا سے جو کچھ ملا ہے اسے لوٹانے کے بجائے اس کے رد و قبول کی مشترکہ کیفیت کو ایک دلکش طرز اظہار کے وسیلے سے دنیا کے روبرو پیش کر دیا ہے۔ وہی سب کچھ جسے شاعری کی اصطلاح میں سماجی بصیرت اور عصری حسیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محبوب راہی

سوئے حجاز پر ایک نظر

پروفیسر ڈاکٹر نذر خلیق (خان پور)

سوئے حجاز معروف تخلیق کار حیدر قریشی کا سفر نامۂ حج ہے۔ جب میں کسی کو تخلیق کار کہتا ہوں تو اس کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ ہر صنفِ ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیت کے اظہار کی پوری قوت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک تخلیق کار کسی ایک صنفِ ادب میں بند نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی پر میرا یہ کلیہ سو فیصد درست ثابت ہوتا ہے کیونکہ حیدر قریشی صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ سفر نامہ نگار، انشائیہ نگار، افسانہ نگار، نقاد، مدیر اور یادنگار کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار اور ایک اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ہر صنفِ ادب میں یکساں روانی اور خوبی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگر نثر کو دیکھیں تو بے ساختگی اور فطری روانی کی خوبی سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ ان کی نثر کو پڑھتے جائیں آپ کو کہیں بھی رکاوٹ یا بوریت محسوس نہیں ہوگی۔ نثر لکھتے ہوئے کسی قسم کی بناوٹ اور ساختگی سے کام نہیں لیتے حتیٰ کہ اردو میں اپنی مادری و پدری زبانوں (پنجابی اور سرائیکی) کا بھی استعمال کر جاتے ہیں بلکہ مادری و پدری زبانوں کے الفاظ کو اردو میں ڈھالتے ہیں جیسے وہ اردو کے ہی ہوں۔ اس سلسلے میں وہ شاعری میں بھی اپنا رویہ برقرار رکھتے ہیں۔

سوئے حجاز ان کا سفر نامۂ حج ہے۔ یوں تو ہر اچھا سفر نامہ دل چسپی کا سامان لیے ہوتا ہے کیونکہ سفر نامے میں کسی بھی علاقے اور ملک کی سیر و سیاحت کا حال ہوتا ہے نہ صرف حال ہوتا ہے بلکہ اس علاقے اور ملک کے بیشتر کمال اور بیشتر خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔ رہن سہن اور رسم و رواج بھی بیان ہوتا ہے، لوگوں کی دل چسپیوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس خطے کے معاشرتی، علمی، ادبی، سیاسی، ثقافتی اور دینی احوال سے بھی پردہ اٹھتا ہے تاہم سفر نامہ اگر مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں ہو تو اور بھی دل چسپ ہو جاتا ہے اور لکھنے والا با کمال ہو تو دل چسپی مزید بڑھ جاتی ہے۔

سفر نامہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے کہ جس میں مختلف اصنافِ ادب کا

ذائقہ ہوتا ہے مثلاً سفر نامے میں انشائیت، افسانویت، شعریت اور کچھ کچھ تاریخیت کی خوبیاں اور خصائص بھی ہوتے ہیں۔اگر سفر نامے میں انشائیے کی گہرائی نہ ہو، افسانے کا تجسس نہ ہو اور شعر کی لطافت نہ ہو تو سفر نامہ پھیکا رہ جاتا ہے۔تاریخیت تو خاص اہمیت رکھتی ہے۔

حیدر قریشی چونکہ ہمہ جہت ادیب اور ہمہ جہت تخلیق کار ہیں۔جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ انشائیہ نگار بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور شاعر بھی۔تاریخ سے انہیں خصوصی شغف رہا ہے۔خصوصاً تاریخِ اسلام سے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا سفر نامہ سوئے حجاز خاص سفر نامہ بن گیا ہے۔سوئے حجاز کا جائزہ لیں تو اس میں سات عمرے اور ایک حج کا سفر شامل ہے۔اس سفر نامے میں حیدر قریشی نے صرف مکہ اور مدینہ میں اپنی مصروفیت کو بیان نہیں کیا بلکہ ان پر اس سفر کے دوران میں جو روحانی اور قلبی کیفیات طاری ہوئیں ان کو بھی بیان کیا ہے۔اس سفر نامے میں خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے قاری اپنے آپ کو بھی سفر نامہ نگار کے ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے۔حیدر قریشی اس سفر کے دوران میں جہاں بھی پہنچے؛ جس مقام کا بھی نظارہ کیا اس کی ماہیت اور تاریخ کو بھی بیان کر دیا۔اس سفر نامے کے مطالعے سے حیدر قریشی کے دینی مطالعے اور روحانی تجربات کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔اس سفر نامے کا جائزہ یوں تو کئی سطحوں پر لیا جا سکتا ہے لیکن میں صرف اس سفر نامے کی فکری اور ادبی حیثیت کو موضوع بناؤں گا۔ حیدر قریشی لکھتے ہیں:۔

''روانگی سے پہلے میرے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ مکہ میں جلالی شان کا سامنا ہوگا۔وہاں شاید میں زیادہ دیر تک ٹِک نہیں پاؤں گا اور مدینہ کی جمالی شان میں زیادہ مزہ آئے گا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ کی جمالی شان میں بھی بہت مزہ آیا لیکن کعبہ شریف میں تو جیسے مجھے باندھ لیا تھا۔محبت کی، عقیدت کی عجیب سی ڈور تھی، بہ قول شاعر۔ جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
میں نے سوئے حجاز میں اسی عالمِ نو کی چند جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔میرا یہ سفر ویسے تو جسمانی، فکری اور روحانی تینوں سطحوں پر ہوا تھا اور تینوں سطحوں پر اس کے اثرات مجھے آج بھی محسوس ہوتے ہیں۔لیکن اس سفر کے روحانی اثرات تو جیسے میری روح کی گہرائیوں تک رچے بسے ہوئے ہیں۔'' (1)

حیدر قریشی کے سفر نامے سوئے حجاز کی فکری سطح کا جائزہ لیں تو ہمیں حیدر قریشی مختلف واقعات کی وضاحت اور توضیح و تشریح کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نئے نئے پہلو آشکار کرتے دکھائی دیتے ہیں جس پر بہت کم غور ہوا ہے۔آیئے حیدر قریشی کے اس سفر نامے کی فکری سطح کا ایک نمونہ ملاحظہ کرتے ہیں۔

''خدا کے بارے میں دو بڑے تصور مختلف صورتوں میں ہمیشہ سے رہے ہیں۔ایک تصور انوار پرستی کا اور دوسرا ارض پرستی کا۔ارض پرستی سے زمین کے درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، بعض جانوروں اور بتوں کو مقدس مانا گیا اور انوار پرستی سے سورج، چاند، ستاروں اور آگ کی پرستش کو رواج ملا۔اصل میں تو یہ سارے تصورات اور عقائد خالقِ کائنات کی جستجو کے سفر ہیں۔بس! سفر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔اسلام نے اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہہ کر اسے روشنی کے عام مظاہر سے ارفع قرار دیا۔دوسری طرف بت پرستی کو ختم کر کے خانۂ کعبہ کو زمینی مرکز بنا دیا۔یوں اسلام نے انوار پرستی اور ارض پرستی کے مروجہ تصورات سے ہٹ کر ایسا معتدل تصور عطا کیا جو خالقِ کائنات کے بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کرتا ہے۔'' (2)

حیدر قریشی کے سفر نامے کی فکری سطح کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

''جنت معلیٰ کے بعد ہم مسجدِ جن کے سامنے گئے۔روایت ہے کہ جن صاحبان حضورؐ سے اس مقام پر ملے تھے اور ایمان لائے تھے۔یہ مسجد صرف نماز کے معین اوقات میں کھلتی ہے پھر بند کر دی جاتی ہے۔ہو سکتا ہے بعض زائرین یہاں آکر بھی ''مشرکانہ'' حرکات کرتے ہوں جو جنوں کو اچھی نہ لگتی ہوں۔مسجدِ جن سے تھوڑا آگے مسجدِ شجر ہے۔یہاں ایک درخت تھا۔آنحضرتؐ جب غارِ حرا تشریف لے جایا کرتے تھے تو آتے اور جاتے ہوئے اس درخت کے نیچے آرام فرمایا کرتے تھے۔حضرت عمرؓ نے مشرکانہ رسومات کے ڈر سے وہ درخت کٹوا کر وہاں مسجد بنوا دی۔'' (3)

حیدر قریشی کے سفر نامے کی فکری سطح ارفع اور غور و فکر کو دعوت دینے والی ہے۔حیدر قریشی جس مقام کے بارے میں ذکر کرتے ہیں اس کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں تاکہ ان کے سفر نامے کا عام قاری بھی استفادہ کر سکے۔حیدر قریشی کے سفر نامے کی یہ فکری خوبی انہیں منفرد سفر نامہ نگار بناتی ہے ورنہ عام طور پر سفر نامہ نگار مقامات کے بارے میں بتاتے چلے جاتے ہیں اور فکری دعوت اور وضاحت بہت ہی کم کرتے ہیں۔حیدر قریشی نے جن مقامات کی فکری وضاحت

کی ہے اس کا تعلق تاریخ سے بھی ہے اور روایت سے بھی۔

حیدر قریشی کے سفر نامے کی فکری سطح کے ساتھ ساتھ ادبی سطح بھی توجہ طلب ہے۔حیدر قریشی سفر نامے میں اپنی تخلیقی قوت کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔آیئے ان کے سفر نامے سے ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

''یوں بھی غارِثور تک پہنچنے کے لیے اور پھر واپس آنے کے لیے پورے ایک دن کا پروگرام بنانا ضروری ہے یا پھر دشمنوں کا کوئی گروہ پیچھے لگا ہو تو چڑھائی آسان ہوسکتی تھی۔۔۔۔۔۔لیکن میرے اندر کے صحرا میں کہیں کسی طرف میرے اپنے ہی اندر کے کافروں اور دشمنوں کا ایک گروہ بھی تو میرے پیچھے لگا ہوا ہے اور مجھے ابھی تک اپنی ذات کے غارِثور تک پہنچنا نصیب نہیں ہو سکا۔شاید میں ابھی تک اپنی ذات میں شعب ابی طالب کے مرحلے سے گزر رہا ہوں۔'' (4)

حیدر قریشی کے اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ایک سفر نامے کو ادبی رنگ دیتے ہیں۔تلمیحات اور واقعات کی ڈوری انسان کے باطن سے باندھ دیتے ہیں۔آج کا انسان باہر کے کافروں اور دشمنوں سے بچ نکلتا ہے لیکن باطن کے کافروں سے اور دشمنوں سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔آج کا انسان تنہائی اور کرب کا شکار ہے۔حیدر قریشی نے اپنے سفر نامے میں کئی مقامات پر اسی طرح کا ادبی رنگ دکھایا ہے۔ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''میں نے منیٰ میں بڑے شیطان کو دیکھتے ہوئے خیال ہی خیال میں اسے کنکریاں ماردیں اور خیال ہی خیال میں دیکھا کہ وہی کنکریاں پلٹ کر مجھے آن لگی ہیں۔شیطان اس تماشے پر مسکرا رہا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم آج کے انسان روایتی شیطان سے کتنا آگے نکل گئے ہیں۔اگلے زمانوں میں کسی پر تکبر کا بھوت یا شیطان سوار ہوتا تو وہ براہِ راست خدائی کا دعویٰ کر دیتا تھا لیکن آج کا متکبر انسان چالاک ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے کی بجائے خدا کو اپنی مذموم نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک ذریعہ اور بہانہ بنا بیٹھا ہے۔اپنی انسانی حالت میں ریا کاری کی عاجزی بھی دکھائی اور خدائی کے سارے اختیارات بھی سنبھال لیے۔یہی تو وہ ذہانت ہے جو نہ فرعون اور نمرود جیسے لوگوں کو نصیب ہوئی نہ شیطان کو ہی سوجھ پائی۔''(5)

حیدر قریشی نے جس ادبی رنگ سے آج کے انسان کی حقیقت بیان کی ہے وہ صرف ایک ادیب اور سچا تخلیق کار ہی بیان کرسکتا تھا۔بسا اوقات ایسے لوگ بھی سفر نامے لکھنے لگ جاتے ہیں جو ادیب یا تخلیق کار نہیں ہوتے لیکن ایسے لوگوں کے سفر نامے پھیکے اور سپاٹ ہوتے ہیں۔کم زور تخلیق کار بھی ایسے سفر نامے تحریر نہیں کر سکتے جو ایک سچا اور بھرپور تخلیق کار لکھ سکتا ہے۔حیدر قریشی سفر نامے میں بھی ادبیت کا وہ رنگ پیدا کر دیتے ہیں یا ادبیت کی وہ تاثیر ابھار دیتے ہیں جو شاعری یا اعلیٰ فکری شہ پارے میں پیدا ہوسکتی ہے۔حیدر قریشی کے ادبی رنگ پورے سفر نامے میں بکھرے ہوئے ہیں۔آیئے ان کے سفر نامے کا ایک اور ادبی رنگ ملاحظہ کرتے ہیں۔

''میں مسجدِ قبلتین کے اندرونی حصے میں جا کر شمالاً جنوباً دیکھنے لگا۔میری سمجھ بوجھ کے مطابق قبلے کی فلاسفی مجھ پر کھلنے لگی۔خدا لامحدود ہے۔خدا لامحدود ہستی کسی محدود مکان میں نہیں آسکتی، بہ قول غالب:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں''(6)

حیدر قریشی تصوف اور روحانیت کی کیفیات کو بھی اس سفر نامے میں ادبی رنگ میں بیان کرتے ہیں۔آیئے ان کا یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو:۔

''صبح ساڑھے آٹھ بجے سے اب رات کے دو بجے کا وقت تھا اور میرے پاؤں کا چکر ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔پاؤں میں سچ مچ چھالے سے پڑ گئے تھے۔شاعری میں چھالوں کا ذکر بڑی آسانی سے کرلیا تھا۔اب سچ مچ واسطہ پڑا تو پتا چلا کہ پاؤں کے چھالے کیا ہوتے ہیں۔زخمی پیر، بے پناہ تکان اور ان سب سے بڑھ کر پریشانی اور بے بسی اسی حالت میں خانہ کعبہ میرے سامنے تھا۔پتا نہیں کیسے بلھے شاہ کی کافی کا بند ذہن میں گونجنے لگا اور شاید میں اسے ہلکے ہلکے اپنے ہونٹوں سے بھی ادا کرنے لگا۔

ایس عشق دی جھنگی وچ مور بولیندا
ایس عشق دی جھنگی وچ مور بلیندا
سانوں قبلہ تے کعبہ سوہنا یار ڈسیندا
سانوں گھائل کر کے فر خبر نہ لئی آ
ساہنواں گھائل کر کے فیر خبر نہ لئی آ
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

میں کتنی دیر تک وہاں تھیا تھیا کی کیفیت میں رہا کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' (7)

سوئے حجاز کی فکری اور ادبی سطح کے علاوہ بھی اور کئی سطحیں ہیں جن کا اس مختصر مضمون میں احاطہ کرنا مشکل ہے تاہم یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حیدر قریشی کا یہ سفرنامہ عصر حاضر کے بیشتر سفرناموں میں منفرد مقام رکھتا ہے حیدر قریشی اپنی دیگر تخلیقات کی طرح اس سفرنامہ میں بھی اپنے تخلیقی جوہر دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ بات طے ہو چکی ہے کہ حیدر قریشی عصرِ حاضر کے چند منفرد اور پہلی صف کے تخلیق کار ہیں اور ان کے لیے کسی بھی صنفِ ادب میں لکھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وہ ایک سچے اور اوریجنل تخلیق کار ہیں اور ادبی دنیا کو ان سے توقع ہے کہ وہ مستقبل میں اپنی تخلیقات سے ادب کے تخلیقی سرمائے میں مزید اضافہ کریں گے۔

حوالہ جات

1۔ سوئے حجاز از حیدر قریشی، سرور ادبی اکادمی جرمنی ستمبر 2004ء
ص: 10, 11
2۔ سوئے حجاز، ص27
3۔ ص40,41
4۔ سوئے حجاز، ص۳۴
5۔ سوئے حجاز، ص47,48
6۔ سوئے حجاز، ص83
7۔ سوئے حجاز، ص120,121

سچے عظیم لوگوں کی تصویریں

ھانی السعید (مصر)

میری مادری زبان اردو نہیں اور حیدر قریشی جیسی قد آور ادبی شخصیت کے فن کے بارے میں لکھنا غیر اردو پس منظر رکھنے والے طالب علم کے لیے قطعاً کوئی آسان کام نہیں۔ مگر ''ادب ساز'' کے گوشۂ حیدر قریشی میں شرکت کرنا اس لیے میرا فرض ہے کہ میں نے ان کی قیمتی کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور ان سے لطف اندوز بھی ہوتا رہتا ہوں۔ حیدر قریشی نے کئی ادبی اصناف میں قلم اُٹھایا اور یہ بھی ثابت کیا کہ وہ جدید اردو ادب کے ایک بڑے ادبی شہسوار ہیں جنھوں نے اپنی جمالیاتی فتوحات کے ذریعے سے اردو زبان و ادب کو توسیع دینے کا کام کیا ہے۔ میں نے ان کی ایک نظم ''قیامت'' کا عربی میں ترجمہ کیا تو تین اہم عربی ویب سائٹس نے اس ترجمہ کو شائع کیا۔ عرب قارئین نے اس نظم کو بہت پسند کیا۔ لیکن میں یہاں ان کی شاعری کی بجائے ان کے فن کی ایک اور جھلک پر اپنے مختصر تاثرات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ان کی کتاب ''میری محبتیں''، میری نظر میں اردو خاکہ نگاری میں ہی نہیں مجموعی اردو ادب کی بھی ایک بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسے حیدر صاحب نے اپنے اہل و اقارب کی نذر کیا ہے اور یہ بات اردو ادب میں بہت ہی نادر ہے۔ انہوں نے اس حصے کا ''اول خویش'' نام رکھا اور ایسے خوبصورت خاکے نقش کیے جن میں خاکہ نگاری، افسانہ نگاری، سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری کا امتزاج دل نشیں صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان خاکوں میں ادب مصوری سے قریب تر ہوتا ہے کہ ہم ان خاکوں / پورٹریٹس کو پڑھ کر ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کے رشتے داروں کی ایسی صاف صاف تصویریں دیکھ رہے ہیں جن کے نقشے ایک خاص اور معتبر زاویۂ نگاہ نے کھینچ لیے ہیں۔ جن میں ان شخصیات کے ساتھ ساتھ حیدر صاحب کے جوہر بھی سامنے آتے ہیں۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ قریشی صاحب نے ''اپنے اندر کی آواز بڑے دھیان سے سن کر'' یہ خاکے تراشے

ہیں۔اسی لیے ہر خاکہ ایک معیاری پورٹریٹ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔دورانِ مطالعہ ہمیشہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے نہیں بلکہ اپنے دل سے لکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھی دورانِ مطالعہ اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم ان خاکوں کے افراد کو پڑھ نہیں رہے بلکہ ان سب سے مل رہے ہیں۔

حیدر قریشی صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں،اس لیے لفظوں کی جادوگری سے قاری کو اسیر بنانے کے فن پر ان کی گرفت مستحکم ہے۔سطروں کے مابین شاعرانہ لب و لہجہ عمدہ ترین خوشبو کی طرح مہکا رہتا ہے۔ زبان کی سادگی،انداز کی سلاست،استعارے کی خوبصورتی اور بیان کی پختگی مجھ جیسے اردو کے معمولی قاری کو بھی جادونگری میں پہنچا دیتے ہیں۔ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ غیر معمولی دکھائی دینے لگتے ہیں۔

میں حیدر قریشی کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ ان کے والد محترم ’’کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تک تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا‘‘۔ کیونکہ ان کے ابا جی کے خوابوں کی حالیہ قطعی تصدیق سے ان کی بزرگی کے بڑے کرشمے آشکار ہو چکے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر انور سدید کے الفاظ دہرا سکتا ہوں کہ ’’برگد کا پیڑ،اجلے دل والا،زندگی کا تسلسل،پسلی کی ٹیڑھ،بے حد معنی خیز خاکے ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جن لوگوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں عظیم تھے‘‘۔اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ مائے نی میں کنوں آکھاں، ڈاچی والیا موڑ مہار وے،مظلوم متشدد،مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ،رانجھے کے ماموں،اور محبت کی نمناک خوشبو، کے زیرِ عنوان خاکے بھی اتنے ہی شاندار ہیں جتنے دوسرے خاکے۔

☆☆یورپ میں مقیم اردو قلم کاروں کی فہرست میں حیدر قریشی صاحب کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ویسے تو انہوں نے مختلف اصناف ادب میں اپنی محنت و ریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت قابلِ لحاظ ہیں۔بعض بالکل ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصری کہانی کاروں میں ان کا ایک بالکل ہی علاحدہ اور ناقابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے،

قیصر تمکین

☆☆جدیدیت کے رسیا اکثر شعرا کے ہاں "نامعلوم کے اسرار" کے نام سے بے معنی ابہام اور بے کنار تجریدیت پائی جاتی ہے۔قاری اس کا سامنا کر کے خوف ناک اجنبیت محسوس کرتا ہے اور بدکتا ہے۔حیدر قریشی کے لیے شعری تجربہ اہم ہے۔لہذا اس کے ہاں ناموجود کے اسرار یا مضامین نو ایک بالکل قدرتی اور متوازن انداز میں بتدریج ابھرتے چلے آئے ہیں۔

ناصر عباس نیر

غزلیں: حیدر قریشی

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں رُوح کی گہرائی سے
اہلِ دنیا بھلا اِس رَمز کو کیسے سمجھیں
عشق رُسوا نہیں ہوتا کبھی رُسوائی سے
متن میں آپ کا ہی ذکر چلا آتا ہے
اچھا ہے بچ کے رہیں حاشیہ آرائی سے
آخری مرحلہ اِس کھیل کا رہتا ہے ابھی
خوش نہ ہو لشکرِ اعداء مِری پسپائی سے
جو رہِ اہلِ ملامت پہ چلا جاتا ہو
مت الجھنا کبھی ایسے کسی سودائی سے
جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر
دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے
مرحلے آئے تھے خوف اور گنہ کے پہلے
روشنی گیان کی پھر پھُوٹی تھی تنہائی سے
بے لحاظی کا کسے دُکھ نہیں ہوتا حیدؔر
ہم نے شکوہ نہ کیا پر کسی ہرجائی سے

☆☆☆

درد و غم سے اسے نکھارتا ہے
عشق انسان کو سنوارتا ہے
برف، بادل، ندی، سمندر، اَشک
پانی بھی کتنے روپ دھارتا ہے
باقی جتنی ہے زندگی دل کی
نذر تیری اِسے گزارتا ہے
اُس پہ سارا معاملہ چھوڑا
اب ڈبوتا ہے چاہے تارتا ہے
خود ہی مطعون ہو گیا آخر
جو فقیروں کو طعنے مارتا ہے
میں تو ساحل کی ریت ہوں پیارے
ریت سے کون گھر اُسارتا ہے
مسترد کرکے جھوٹی تاریخیں
وقت خود جھوٹ سچ نتارتا ہے
کس نے اندر کے در سے دی ہے صدا
کون ہے اور کسے پکارتا ہے
اک فرشتہ ہے عشق کا حیدؔر
مجھ پہ جو شاعری اُتارتا ہے

☆☆☆

کون دیکھے گا بھلا میرے خدا میرے بعد
رنگ لائے گی اگر میری دعا میرے بعد
رُوبرو میرے بنا بیٹھا تھا پتھر کی طرح
کسی چشمے کی طرح پھُوٹ بہا میرے بعد
عشق کے قصے سبھی مجھ پہ ہوئے آکے تمام
کوئی مجنوں، کوئی رانجھا نہ ہوا میرے بعد
اس میں مل جائے گا جا کر مِرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد
جس نے دشمن کو مِرے قتل پہ اُکسایا ہے
لینا چاہے گا وہی خون بہا میرے بعد
ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا
زندگی! قرض ترا ہوگا ادا میرے بعد
روز طوفان اُٹھانے کی مشقت تھی اسے
دشت بے چارے کو آرام ملا میرے بعد
میرؔ و غالبؔ کی عطا اُن کی زمیں میں یہ غزل
حیدؔر اوروں پہ بھی ہوگی یہ عطا میرے بعد

☆☆☆

وزیرِ فِیل اور شاہ پھر سے بدَل رہا ہے
وہ چال شاید اب اور ہی کوئی چَل رہا ہے
بچی ہوئی ہے بس اب تو خاک اور راکھ باقی
کہ اب نہ رسی نہ کوئی رسی کا بل رہا ہے
چلو پھر ابلیس کو بلاؤ اسے بتاؤ
جو ابنِ آدم پھسل گیا تھا سنبھل رہا ہے
کچھ اِس طرح ڈوبنے لگی ہے یہ دل کی دھڑکن
کہ جیسے دھیرے سے کوئی گھر سے نکل رہا ہے
کسی کے جَور وستم کی حیدؔر کرامتیں ہیں
بجھا ہوا ہے یہ دل مگر پھر بھی جل رہا ہے

☆☆☆

مِرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں، کس رُت میں کیسے خواب لگے
نہ پُورا سوچ سکوں، چھوسکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گُل، کبھی کتاب لگے
نہیں ملا تھا تو برسوں گزر گئے یوں ہی
پر اب تو اس کے بِنا ہر گھڑی عذاب لگے
تمہارے ملنے کا مل کر بھی کب یقیں آیا
یہ سلسلہ ہی محبت کا اک سراب لگے
یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے
ہمیں تو اچھا ہی لگتا رہے گا وہ حیدؔر
بلا سے ہم اُسے اچھے لگے، خراب لگے

☆☆☆

عشق میں اپنی ہی جب خاک اُڑالی ہم نے
پھر وہی خاک ترے پیار پہ ڈالی ہم نے
ڈھنگ کا کام کوئی ہم سے کبھی ہو نہ سکا
یوں تو سرسوں بھی ہتھیلی پہ جَما لی ہم نے
خود بھی پہچان نہیں پاتے ہیں اپنی صورت
جانے کس روگ میں یہ شکل بنا لی ہم نے
وہ بھی انکار کا عادی نہ رہا تھا بے شک
کب کوئی اس کی تمنّا کبھی ٹالی ہم نے
وہ سمجھ دار ہے مطلب تو سمجھ جائے گا
بات آدھی ہی کہی، آدھی چُھپالی ہم نے
کھیل رنگوں کا جو پھولوں سے سمجھ میں آیا
سیکھ لی خوشبو سے آوارہ خیالی ہم نے
جو دعا کرتے تھے اُلٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے
یونہی تُک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدؔر
بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

☆☆☆

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے
رہا نہ عالمِ ہجراں، نہ وصل یاب ہوئے
بس اتنی بات تھی دو دل کبھی نہ مل پائیں
کہیں پہ تپتے ہوئے تھل، کہیں چناب ہوئے
عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک، نہ مستجاب ہوئے
ذہانتیں تھیں تری یا اناڑی پن اپنا
سوالِ وصل سے پہلے ہی لاجواب ہوئے
حقیقت اتنی ہے اُس کے مِرے تعلق کی
کسی کے دکھ تھے مِرے نام انتساب ہوئے
جسے سمجھتے تھے صحرا وہ اک سمندر تھا
کھلا وہ شخص تو ہم کیسے آب آب ہوئے
نہ آیا ڈھنگ ہمیں کوئی عشق کا حیدؔر
نہ دل کے زخموں کے ہم سے کبھی حساب ہوئے

☆☆☆

وہ جو ابھی تک خاک میں رُلنے والے ہیں
سچے موتیوں میں اب تلنے والے ہیں
اپنی ذات کے دروازے تک آ پہنچے
بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں
دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم
سو اب اُس کے عشق میں گھلنے والے ہیں
واقفیت ہے اِن سے اپنی برسوں کی
دُکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں
آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری
حیدرؔ مَیل دِلوں کے دُھلنے والے ہیں

☆☆☆

جو بَس میں ہے وہ کر جانا ضروری ہو گیا ہے
تری چاہت میں مَر جانا ضروری ہو گیا ہے
ہمیں تو اب کسی اگلی محبت کے سفر پر
نہیں جانا تھا‘ پر جانا ضروری ہو گیا ہے
ستارا جب مِرا گردش سے باہر آ رہا ہے
تو پھر دل کا ٹھہر جانا ضروری ہو گیا ہے
درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے
اندھیرا اِس قدر گہرا گیا ہے دل کے اندر
کوئی سورج اُبھر جانا ضروری ہو گیا ہے
بہت مشکل ہوا اندر کے ریزوں کو چھپانا
سو اب اپنا بکھر جانا ضروری ہو گیا ہے
تجھے میں اپنے ہر دُکھ سے بچانا چاہتا ہوں
ترے دل سے اُتر جانا ضروری ہو گیا ہے
نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اِس دل پہ حیدرؔ
پُرانے زخم بھر جانا ضروری ہو گیا ہے

☆☆☆

اب تو جذبے زبان مانگتے ہیں
پَر بُریدہ اُڑان مانگتے ہیں
عشق کی پڑھنا چاہتے ہیں نماز
اور اِذنِ اذان مانگتے ہیں
دور سے صرف دیکھتے ہی رہیں
کب یہ ہفت آسمان مانگتے ہیں
ہم تہی دست آبروئے فقر
سود دے کر زیان مانگتے ہیں
دل کی اک بات کہنا ہے لیکن
پہلے جاں کی امان مانگتے ہیں
یا تو کچھ بھی نہیں ہیں مانگتے، یا
تیرے سارے جہان مانگتے ہیں
ایسی عمروں کے پیار تو حیدرؔ
جسم و جاں سے لگان مانگتے ہیں

☆☆☆

جب اُس نے خاک اُڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کر لیا ہے
حدیں وہ کر گیا ہے پار سب جورو ستم کی
سو ہم نے صبر پہلے سے زیادہ کر لیا ہے
نہیں، اس جیسی عیاری تو ممکن ہی نہیں تھی
زمانے سے ذرا بس استفادہ کر لیا ہے
کچھ ایسا ہے کسی کی سر زمینِ دل کا جادو
محبت کا سفر اب پا پیادہ کر لیا ہے
چلو حیدرؔ غنیمت ہے یہ صندل کی مہک بھی
کہ یاروں نے تو لکڑی کا برادہ کر لیا ہے

☆☆☆

گھنی تاریکیوں میں روشنی کی آس باقی ہے
یہی دولت بہت ہے جو ہمارے پاس باقی ہے
تمہارے قُرب نے ٹھنڈک کا اک احساس تو بخشا
مگر اِس جسم کی جلتی، مچلتی پیاس باقی ہے
تمہارے ہی لئے ہیں دل کے جتنے مل سکیں ٹکڑے
تمہارے واسطے ہے تن پہ جتنا ماس باقی ہے
چلو ہم بے سلیقہ ہیں مگر یہ بھی تو بتلاؤ
سلیقہ عشق کا پھر اور کس کے پاس باقی ہے
گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک رُوح میں مہکار کا احساس باقی ہے
نبھانا ہے ابھی تو قول اپنے باپ کا ہم نے
ابھی اپنے مقدر کا کڑا بَن باس باقی ہے
ابھی قرضے چکانے ہیں عزیزوں کے سبھی حیدرؔ
ابھی موسم بدلنے کی ہماری آس باقی ہے

☆☆☆

جبریت کے موسم کا جب عذاب آتا ہے
صرف اہلِ دل پر ہی تب عتاب آتا ہے
وہ حساب تو لے گا پر حساب کیا دیں گے
ہم گناہ گاروں کو کب حساب آتا ہے
بس لحاظ کرتے ہیں ایک بے مرّوت کا
ورنہ اُس کی باتوں کا بھی جواب آتا ہے
عشق میں بچھڑ جائیں اور چاہے مل جائیں
دل زدوں پہ ہر حالت میں عذاب آتا ہے
لب مکر گئے لیکن دل نہیں مکر پایا
جب بھی خواب آتا ہے تیرا خواب آتا ہے
پہلے سے بھی بڑھتے ہیں صرف مسئلے حیدرؔ
جھوٹ بولنے سے کب انقلاب آتا ہے

☆☆☆

طلوعِ صبح سے پہلے شگافِ نیل ہونا ہے
یہ منظر سامنے کا جلد ہی تبدیل ہونا ہے
گزرتی سرد اور لمبی اندھیری شب کے سینے میں
ابھی کچھ اور شمعوں کا لہو تحلیل ہونا ہے
پھر اہلِ جور کے حق میں فقیہِ شہر کے صدقے
حدیثِ جبر کی کوئی نئی تاویل ہونا ہے
ہماری ایڑیوں سے اب کوئی چشمہ نہ اُبلے گا
نہ قسمت میں ہماری کوئی بیتِ اِیل ہونا ہے
تمہارے دل کی بنجر سر زمیں سیراب کرنے کو
ہماری خشک آنکھوں ہی کو آخر جھیل ہونا ہے
کبھی دریا کی لہروں پر، کبھی صحرا کے سینے میں
محبت کا نیا قصہ سدا تشکیل ہونا ہے
ہمارا خواب تو بے شک ادھورا رہ گیا حیدرؔ
مگر تعبیر کی تو لازماً تکمیل ہونا ہے

☆☆☆

دریا کہ نہر میں ہوں
پر اپنی لہر میں ہوں
کہنے کو صرف پل بھر
اور سارے دہر میں ہوں
پتھر کے لوگ سارے
جادو کے شہر میں ہوں
یہ کون مہرباں ہے
یہ کس کے قہر میں ہوں
تریاق بن کے حیدرؔ
نفرت کے زہر میں ہوں

☆☆☆

درد اندر کے سب آنکھوں میں اُبھر آئے تھے
عشق میں جب ہمیں پانی کے سفر آئے تھے
شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے یہ شہربدر آئے تھے
آپ نے ہی درِ دل وا نہ کیا تھا ورنہ
صبح کے بھولے تو دوپہر کو گھر آئے تھے
یہ الگ بات کہ جی اُٹھے دوبارہ لیکن
ہم تری راہ میں تو جاں سے گزر آئے تھے
بازگشت اپنی ہی آواز کی بنتا تھا ہمیں
ہم نے کب لَوٹ کے آنا تھا مگر آئے تھے
ایک سوہنی کی پذیرائی کی خاطر حیدرؔ
دل کے دریا میں کبھی کتنے بھنور آئے تھے

☆☆☆

جہاں بھر میں ہمارے عشق کی تشہیر ہوجائے
اُسے کس نے کہا تھا دل پہ یوں تحریر ہو جائے
میں سچا ہوں تو پھر آئے مِری تقدیر ہوجائے
میں جھوٹا ہوں تو میرے جرم کی تعزیر ہوجائے
میں اپنے خواب سے کہتا ہوں آنکھوں سے نکل آئے
ذرا آگے بڑھے اور خواب سے تعبیر ہوجائے
زباں ایسی کہ ہر اک لفظ مرہم سالگے اُس کا
نظر ایسی کہ اُٹھتے ہی دلوں میں تیر ہو جائے
وہ ہر پل جس میں اپنے پیار کی یادیں دھڑکتی ہیں
مِری جاگیر ہو جائے، تجھے زنجیر ہو جائے
سبب کچھ تو رہا ہوگا ترے حیدرؔ کی حالت کا
کبھی جو بے سبب ہنس دے، کبھی دلگیر ہوجائے

☆☆☆

گرچہ ہمیں ہے پہلے بھی اک زک لگی ہوئی
لیکن گئی نہ یاس سے چشمک لگی ہوئی
ہر آن ہے گمان کہ شاید وہ آ گئے
دھڑکن ہے دل کی یا کوئی دستک لگی ہوئی
اپنا تمام حصہ اُنہیں دے کے آ گیا
آخر کو ختم کرنی تھی جھک جھک لگی ہوئی
تم اہلِ علم وفضل ہو لیکن کچھ اِس طرح
جیسے کوئی کتاب ہو دیمک لگی ہوئی
اُس کی محبتیں ہیں کسی اور کے لئے
تہمت ہمارے سر پہ ہے بے شک لگی ہوئی
پڑتا ہے یوں تو حُسن پہ اِس کا اثر مگر
اچھی لگی ہے آپ کو عینک لگی ہوئی
حیدرؔ مذاق مت اِسے سمجھو یہ عشق ہے
بازی ہے اِس میں پاؤں سے سر تک لگی ہوئی

☆☆☆

عشق کی دنیا کے اَن دیکھے نگر رہتے ہیں
عُمر تھوڑی سی ہے اور اِتنے سفر رہتے ہیں
ابھی کچھ اور چکانے ہیں زمانے کے حساب
اِس کے کچھ قرض ابھی تک مِرے سر رہتے ہیں
کبھی سوچا ہی نہیں آپ نے، یہ کون ہیں جو
اپنا گھر ہوتے ہوئے آپ کے گھر رہتے ہیں
شہر اک اور وہاں آپ ہی بَس جاتا ہے
جس جگہ جا کے ترے شہربدر رہتے ہیں
متلاطم ہے ابھی تک مِرے دل کا دریا
اور دریا میں بہت سارے بھنور رہتے ہیں
جسم کا سحر، طلسم آنکھ کا، لب کے منتر
اُس میں بھی کتنے فسوں ساز ہنر رہتے ہیں
چور سا آن چھپا ہے مِرے من میں حیدرؔ
اُس کے سینے میں بھی سو طرح کے ڈر رہتے ہیں

☆☆☆

دیارِ دل میں کسی نے وُرود کرتے ہوئے
بجھا دیا، ہمیں روشن وجود کرتے ہوئے
یہ میرے جسم نے کیا کھیل مجھ سے کر ڈالا
مجھے نکال دیا بے وجود کرتے ہوئے
پہنچ گئے جو کنارے کبھی تباہی کے
تو بچ کے آ گئے وردِ دُرود کرتے ہوئے
کھڑے تھے شاہ کئی جھولیوں کو پھیلائے
فقیر گزرے تھے جس رہ سے جود کرتے ہوئے
کئی برس کی جدائی بھی کچھ بدل نہ سکی
وہ زُودرنج ملا، رنج زُود کرتے ہوئے
کسی کی یاد جلائی تھی جس گھڑی حیدؔر
فضا مہک اُٹھی صندل کو دُود کرتے ہوئے

☆☆☆

آگ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی
کس قدر مہنگی اسے شعلہ بیانی پڑ گئی
صبر کو میرے جو میری بے بسی سمجھے رہا
دیکھ کیسے اُس پہ میری بے زبانی پڑ گئی
ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے
پھر مِرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی
تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی
اعتبار اک دوسرے پر کب ہمیں تھا زندگی
جھوٹی مُوٹی دوستی تھی اور نبھانی پڑ گئی
مُشک جیسی کوئی بھی شے کب چھُپانے سے چھپی
آپ کو پھر کس لئے صاحب چھُپانی پڑ گئی
خوب واقف تھے کسی کے پیار سے حیدؔر مگر
آزمائی چیز پھر سے آزمانی پڑ گئی

☆☆☆

آپ کو بھی درپئے آزار ہونا تھا، ہوئے
اور ہم نے زیرِ بارِ یار ہونا تھا، ہوئے
تہمتوں کے اور بہتانوں کے اعزازات کو
جب ہمارے ہی گلے کا ہار ہونا تھا، ہوئے
لاکھ صحرا اور سمندر بجھ گئے تھے راہ میں
اِن فقیروں نے جہاں سے پار ہونا تھا، ہوئے
خواب کی دنیا میں کتنی دیر تک رہتے بھلا
اک نہ اک دن تو ہمیں بیدار ہونا تھا، ہوئے
عشق میں تکریم بھی اپنا مقدر تھی، ہوئی
اور پھر رُسوا سرِ بازار ہونا تھا، ہوئے
یہ بھی آنا تھا مقام آخر تمہاری چاہ میں
ہم نے اپنے آپ سے بے زار ہونا تھا، ہوئے
ذہن و دل کی جنگ میں خاموش رہتے کس طرح
خود سے حیدؔر برسرِ پیکار ہونا تھا، ہوئے

☆☆☆

روشنی کا استعارہ کر لیا
دل نے ہر آنسو ستارا کر لیا
بے وفا دنیا سے کچھ تو نبھ گئی
ساتھ کیا تھا بس گزارا کر لیا
گلستاں اُس نے کیا تھا آگ کو
ہم نے شبنم کو شرارہ کر لیا
کم نہیں ہم بھی ثمود و عاد سے
کیوں لحاظ آخر ہمارا کر لیا
تیری وحدت سے سمجھ پائے تجھے
اور کثرت میں نظارہ کر لیا
کون ہے پھر اب مِرے دُکھ کا سبب
خواہشوں سے تو کنارا کر لیا
آج حیدؔر موڑ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کر لیا

☆☆☆

اک خواب کہ جو آنکھ بھگونے کے لئے ہے
یہ واقعہ ہوا اپنے وقوع سے پہلے

اک یاد کہ سینے میں چبھونے کے لئے ہے
کہ اختتامِ سفر تھا ، شروع سے پہلے

اک زخم کہ سب زخم بھلا ڈالے ہیں جس نے
نہیں تھی لذتِ سجدہ، رکوع میں لیکن

اک غم کہ جو ، تا عمر بلونے کے لئے ہے
اک اور کیف تھا، کیفِ خشوع سے پہلے

اک روح کہ سونا ہے مگر مَیل بھری بھی
نصوص کو بھی کبھی دیکھ لیں گے فرصت میں

اک آگ اسی مَیل کو دھونے کے لئے ہے
ابھی نمٹ تو لیں ''مومن'' فروع سے پہلے

آنکھوں میں ابھی دھول سی لمحوں کی جمی ہے
معافی مانگنا پھر بعد میں خلوص کے ساتھ

دل میں کوئی سیلاب سا رونے کے لئے ہے
گناہ کرنا خشوع و خضوع سے پہلے

دل کو تو بہت پہلے سے دھڑکا سا لگا تھا
اُسی کے پاس تو جانا ہے لوٹ کر آخر

پانا ترا شاید تجھے کھونے کے لئے ہے
سو خوب گھومئے ، پھریئے ، رجوع سے پہلے

کشتی کا یہ ہچکولہ ، یہ ملّاح کا چکّر
سیاہِ شب نے تو اندھیر کر دیا تھا بہت

کشتی کو نہیں، مجھ کو ڈبونے کے لئے ہے
سو آگیا ہوں میں وقتِ طلوع سے پہلے

تقدیر سے لڑ سکتا ہے کوئی کہاں حیدرؔ
یہ عید آئی ہے کس قتل گاہ میں حیدر

وہ حادثہ ہونا ہے جو ہونے کے لئے ہے
سلام پھیر لیا ہے رکوع سے پہلے

☆☆☆ ☆☆☆

کون انگڑائی سی لیتا ہے نفس کے اندر
اس دربار میں لازم تھا اپنے سر کو خم کرتے

لذتِ وصل مہکتی ہے ہوس کے اندر
ورنہ کم از کم اپنی آواز ہی مدھم کرتے

پھر سے در پیش ہوا لگتا ہے باہر کا سفر
اس کی انا تسکین نہیں پاتی خالی لفظوں سے

لہر سی اُٹھنے لگی ہے کوئی نَس کے اندر
شاید کچھ ہوجاتا اثر، تم گریۂ پیہم کرتے

رَس بنایا گیا اس زندگی کو پہلے، پھر
سیکھ لیا ہے آخر ہم نے عشق میں خوش خوش رہنا

موت کا زہر ملایا گیا رَس کے اندر
درد کو اپنی دوا بناتے، زخم کو مرہم کرتے

پھول نے صرف بکھیری ہے مہک بھینی سی
کام ہمارے حصے کے سب کرگیا قیس دوانہ

اصل خوشبو تو وگرنہ ہے سِرَس کے اندر
کونسا ایسا کام تھا باقی جس کو اب ہم کرتے

قافلے والے بہت خوش تھے دمِ رخصت تو
ہر جانے والے کو دیکھ کے رکھ لیا دل پر پتھر

سسکیاں کس کی تھیں آوازِ جرس کے اندر
کس کس کو روتے آخر،کس کس کا ماتم کرتے

کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا
دل تو ہمارا جیسے پتھر سے بھی سخت ہوا تھا

آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر
پتھر پانی ہو گیا،سوکھی آنکھوں کو نم کرتے

حیدرؔ اک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدرؔ

کیا سے کیا ہو گیا ہوں سات برس کے اندر
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

☆☆☆ ☆☆☆

نظمیں

حیدر قریشی

ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام

ہزاروں سال پہلے تم
ہوا کے تند جھونکوں کی طرح آئے
ہماری سر زمیں کو روندتے
تم نے گذرنا تھا
مگر تم تو بگولے بن گئے جیسے
جو باغوں، جنگلوں، کھیتوں کو
بس تاراج کرتے تھے
جو ہم پر راج کرتے تھے
تمہارے رقصِ جشنِ فتح میں
صدیوں تلک اڑتے رہے تھے
اصل باشندوں کی آزادی کے،
ان کی عزت و ناموس کے ٹکڑے
ہمیں محکوم کر کے تم رہے صدیوں تلک نازاں
یہاں پھر جو ہوا وہ سب الگ قصہ کہانی ہے

چلو چھوڑو اب اس قصے، کہانی کو،
نیا قصہ سنو!
اب میں دراوڑ
خود تمہاری سر زمیں پر آنے کو تیار بیٹھا ہوں
مگر اندھے بگولے کی طرح ہرگز نہیں
میں تو فقط بادِ صبا کے نرم جھونکے
کی طرح دھیرے سے آؤں گا
تمہارے گلشنوں کو تاخت و تاراج
کرنے کو نہیں، میں ۔۔۔۔۔ بلکہ ان کی
خوشبوؤں کو اپنے من میں
جذب کرنے کے لئے آؤں گا اور
اپنی محبت کے وسیلے سے مجھے
اب آریاؤں کے دلوں پر راج کرنا ہے
سنو، اے آریاؤ!
میں تمہارے پاس آنے کے لئے تیار بیٹھا ہوں!

☆☆☆

منی پلانٹ

زمین سے جُڑا رہوں
تو تب بھی لہلہاؤں میں
زمیں سے کاٹ کر مجھے
بوتلوں میں پانی بھر کے ڈال دو
تب بھی میں ہرا رہوں
پَیر ہی جمانے کی مجھے کہیں جگہ ملے
میں جہاں بھی جا بسوں
وہیں ہرا بھرا رہوں
بلکہ میں جہاں رہوں
نصیب اُس کے جاگ اُٹھیں
میں کوئی خشک شاخ تو نہیں
کسی درخت کی!

☆☆☆

ایک خواہش کی موت

وہ اک بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
جو اِس دل کے صحرا میں بستی تھی
آنکھوں میں اُمید کی روشنی کے دیئے سے جلاتی
کبھی دل کے زم زم سے چھینٹے اُڑاتی
وہ میرے ہی چھینٹوں سے مجھ کو بھگو کر جو ہنستی
تو جیسے مِرے دل کا صحرا
کھجوروں کے سرسبز میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں
ساری بہاریں سمیٹے ہوئے مسکراتا

مِرے دل کا صحرا کھجوروں کے سرسبز
میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں ساری بہاریں
سمیٹے ہوئے مسکراتا تو دہکے ہوئے گرم سورج
کے سینے میں بھی پھول سے کھلنے لگتے

مگر ایک دن کیا ہوا
جانے کیسے ہوا
وہی بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
مجھے چھوڑ کر چاند میں جا بسی
پتھروں کے نگر میں وہ جاتے ہوئے
میرے صحرائے دل کو بھی ہمراہ لیتی گئی
اس کے بدلے میں وہ مہرباں
میری آنکھوں کو کوئی سمندر عطا کر گئی
تب سے آنکھوں کو بخشا ہوا یہ سمندر
سدا چاند کی سمت
امنڈتا، چھلکتا
ہمکتا ہی رہتا ہے!

☆☆☆

دعا گزیدہ

سلامت رکھنا مولا!
سر پہ سایہ میرے ابُوّ کا۔۔۔۔۔۔دعا مانگی
کھلی آنکھیں تو میں دشتِ جدائی میں
سلگتی ریت پر تھا پا برہنہ سا

پھر امی جی کی لمبی عمر کی میں نے
دعائیں کیں
اک آندھی سی چلی اندھی جدائی کی
تو ماں بھی چھِن گئی مجھ سے

کھلے دشتِ جدائی میں سَوا نیزے پہ
سورج جیسی کوئی شے اُتر آئی
تو پھر سائے کی خواہش بھی
دعا کے روپ میں ڈھلنے سے
صاف انکار کر بیٹھی
اسے یہ خوف تھا سائے کے بدلے میں
کہیں سورج ہی سر پر ٹوٹ کر نہ گر پڑے

ہر اک خواہش دعا کے روپ میں

ڈھلنے سے خائف ہے
مگر مولا!
مجھے تجھ سے نہ کوئی بدگمانی ہے
نہ کوئی بے یقینی ہے
دعا کی استجابت کا یقیں بھی ہے
مگر مولا۔۔۔۔۔۔ مجھے اپنے
سبھی باقی عزیزوں سے محبت ہے
ابھی میں ان کو کھودینا نہیں ہوں چاہتا مولا!
سو ان کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے مانگنا تجھ سے
معافی مانگتا ہوں اب فقط
پچھلی دعاؤں کی!

☆☆☆

تخلیق در تخلیق

خدا خلاّق ہے انسان کی تخلیق کرتا ہے
یہی انساں پھر اپنی جستجو میں خود نئی تخلیق کرتا ہے
یہی انسان لفظوں سے، سُروں سے اور رنگوں سے
کہیں نظموں، کہیں نغموں،
کہیں پینٹنگز کو زنجیر کرتا ہے
یہ نظمیں، گیت، تصویریں کہ تخلیقات ہیں اس کی
مگر اس کی طرح یہ سب بھی اپنے اپنے
جسموں کے گھروں میں
سانس لیتی ہیں،
معانی کے کئی پرتوں کی صورت خود نئی تخلیق
کرتی ہیں، نئی تخلیق میں پھر اپنی ہی تفہیم کرتی ہیں
یہ ہر خلاّق کا، تخلیق کا، جیسے
خود اپنی کھوج، اپنی جستجو، تفہیم کا
تخلیق در تخلیق کا کوئی انوکھا سلسلہ سا ہے
اسی تخلیق در تخلیق ہی میں ارتقا کی داستاں
جادو جگاتی ہے

’کہانی ارتقا کی کیا فقط آگے کو ہی بڑھتی چلی جاتی ہے یا بس اک دائرے میں گھومنا اس کا مقدر ہے؟‘
زمانہ سوچ میں غلطاں و پیچاں ہے!
مگر مجھ سے مری اک نظم سرگوشی میں کہتی تھی:
”زمانہ جو بھی کہتا ہے، یقیناً اس کی ہر اک بات میں
اک جزوی سچائی بھی ہوتی ہے۔ کہانی ارتقا کی
آگے بھی بڑھتی ہے لیکن دائرے کی شکل میں
ایسے!“

یہ کہہ کر نظم نے اس دائرے کو
ڈرائنگ کر کے ہی دکھایا تھا کہ اس میں سے
کوئی الہامی نغمہ سا اُبھر آیا!

☆☆☆

چلو اک نظم لکھتے ہیں

وہی موسم، وہی رستے،
وہی شام و سحر، یکسانیت، بے کیف سے لمحے
گنہ کی رغبتیں، اشکِ ندامت
نیکیوں کی لذتیں

اسرار جتنے ہو چکے ہیں منکشف،
اپنا تحیر کھو چکے ہیں
اب مسرّت غم زدہ ہے
اور حیرت کی چمک بجھنے لگی ہے،
جستجو سونے لگی ہے

بدن سے روح تک کے کتنے ہی اسرار تھے
جو کھل چکے کب کے
کسی تپتے ہوئے صحرا کی گرمی پی گئے دریا
عجب سیرابیاں تھیں، پیاس کی لذت ہی کھو بیٹھے
نہ اب کوئی غزل یا ماھیا کہنے کی
اندر سے کوئی تحریک ہوتی ہے
نہ سردی اور گرمی میں کوئی تفریق ہوتی ہے

چلو ٹھہرے ہوئے ان موسموں میں
کوئی تبدیلی سی لاتے ہیں
تحیّر کی نئی دنیاؤں کی سوئی ہوئی سی
جستجو بیدار کرتے ہیں، مسّرت کو ہنساتے ہیں
چلو اس بلب کا سوئچ آف کر کے
موم بتی کو جلاتے ہیں
قلم کاغذ اٹھاتے ہیں
کئی برسوں کی اس یکسانیت کی گرد کو
سر سے جھٹکتے ہیں
ذرا رستہ بدلتے ہیں
چلو اک نظم لکھتے ہیں!

☆☆☆

ماہیے: حیدر قریشی

کُونجوں کی قطاریں ہیں
درد سے کُرلائیں
یادوں کی جوڑاریں ہیں

دُکھ حق تھا غریبوں کا
تم سے گلہ کوئی
نہ ہی شکوہ نصیبوں کا

اس پیار کی زنجیریں
دل کا ہیں سرمایہ
یہ درد کی جاگیریں

زخموں سے بھرا سینہ
عشق کی دنیا میں
جینا ہے یہی جینا

مسجد ہے نہ مندر ہے
دل یہ ہمارا تو
اک دکھ کا سمندر ہے

آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں بھی
وہ پاس ہمارے ہیں

نہیں، ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

تُو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

سب دُکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں

دکھ درد سے ہاروں کے
دیکھتے آ کے کبھی
حال اپنے بِماروں کے

بے نام اُداسی کو
کون سمجھ پاتا
تیرے بَن باسی کو

بے کار کے رونے سے
کچھ بھی نہیں ملتا
پانی کو بلونے سے

یہ دل بھی لگا کھلنے
لہنگا ہرا پہنے
آیا ہے کوئی ملنے

چاہت کی گواہی تھے
ہم بھی کبھی یارو
اک ہیر کے ماہی تھے

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہوولیوں کی

توبہ کی جو ٹھانی ہے
سوچ لو پھر یہ تو
توہینِ جوانی ہے

رائن☆ سے چناب مِلا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب مِلا
(☆دریائے رائن جرمنی کا مشہور دریا ہے۔

لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

دل کو شاداب کیا
تیری محبت کے
غم سے سیراب کیا

پھولوں کو پرونے میں
سوئی تو چبھنی تھی
اس ہار کے ہونے میں

کیسے اِترائے تھے
پہلے پہل دل پر
جب زخم سجائے تھے

ہم یونہی نہیں ٹوٹے
تیری طرح نکلے
وعدے بھی ترے جھوٹے

کچھ بھی تو نہ پایا تھا
اُس کی محبت میں
بس دل کو جلایا تھا

دن تیس مہینے میں
درد جدائی کا
بڑھتا رہا سینے میں

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

پھر بعد زوال ہمیں
''ظہر'' نے بخشی ہے
امیدِ کمال ہمیں

جب ''عصر'' اشارہ ہوا
سُود میں ڈھلنے لگا
جتنا بھی خسارہ ہوا

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
''مغرب'' کی اذان ہوئی

تسلسل

رُومی، شامی، جگنو
میری بیٹی کی
لے آتے ہیں خوشبو

گانی والے توتے
شہری اور سونو
دونوں میرے پوتے

پوتوں کے آنے سے
ملتا ہوں اپنے
دادا کے زمانے سے

ماہا مری پوتی ہے
روتے ہوئے ہنستی
ہنستے ہوئے روتی ہے

اک پوتی اور آئی
بی بی علیشا، جو
سونو کی ہے ماں جائی

جب پوتی ہوئی ماہم
باہم رشتے بھی
کچھ اور ہوئے باہم

ہنسنے ہیں کہ رونے ہیں
بچوں کے بچے
سب میرے کھلونے ہیں

سب ہی مجھے پیارے ہیں
پوتے، نواسے سب
دل کے سی پارے ہیں

جیون کا تسلسل ہے
دہراتا خود کو
یوں وقت مسلسل ہے

افسانہ

میں انتظار کرتا ہوں

حیدر قریشی

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔
میں کسی صحرا میں پیاس کی شدّت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
اور ماماتا کی ماری میری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔
میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔
اور میرے بھائی ان سوداگروں سے بھی میری قیمت وصول کر رہے ہیں جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گے اور غلام بنا کر لے جائیں گے۔
میں کسی جنگل میں بَن باس کے دن گزار رہا ہوں۔
مری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لیے کہتی ہے۔ میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

☆☆

میں کہ سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میری تاریخ کے سفر کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے "لچھمن ریکھا" عبور ہوتے ہی تاریخ کے سفر کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا ہے۔ میں کسی غیبی امداد کا منتظر ہوں۔
میں اندھے کنوئیں سے نکال لیا گیا ہوں۔
مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں کہ زلیخا میرے تعاقب میں ہے اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لئے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔
پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔
اور میری ماں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر چُور ہو گئی ہے۔ ابھی تک پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر پیاس کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔ مگر دور دور تک کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔
میری بے گناہی۔۔ میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔
میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔
وہ جو بادشاہ زادی ہے۔ میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔
میں دکھ میں ہوں کہ حاکم کی بدکار بیوی مجھے میری نیکی کی کڑی سزا دلواتی ہے۔
میں قید میں ہوں کہ بدکاری کی تہمت مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔
اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے کہ میری پاک دامن بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کیا گیا ہے۔
یہ سارے جھوٹے الزام اور تہمتیں وہی لگا رہے ہیں جو خود بدکار ہیں۔ جو میرے سوتیلے عزیز ہیں۔ وہ میرے گرد سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن جمع کر رہے ہیں تا کہ اس میں نفرتوں کی آگ لگا کر مجھے بھسم کر ڈالیں۔
میں اس آگ سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہوں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔

☆☆

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لیے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں.....چاند، سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میں سوچتا ہوں۔
میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟
میری پاکدامن بیوی کی صفائی کون دے کہ میرا واسطہ بدکاروں سے ہے جو اپنی برائیاں چھپانے کے لئے دوسروں پر تہمتیں عائد کرتے ہیں۔
اور میری اپنی صفائی کون دے کہ میں اب بھی گناہ پر آمادہ ہو جاؤں تو وہی عورت میری بے گناہی کی گواہی دے کر مجھے چھڑا لے جائے گی جس نے مجھے اس حال

تک پہنچایا ہے۔
اور میری ماں.... بادشاہ زادی.... جو میری حالت نہیں دیکھ سکتی اور اس کی بے قراری دیکھ کر میرا اپنا دِل خون ہوتا ہے اور میں پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ایڑیاں رگڑنے لگتا ہوں، وہ کب تک پانی کی تلاش میں پہاڑیوں کا سفر کرتی رہے گی۔

☆☆

سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن میرے چاروں طرف جمع کیا جا چکا ہے اس ایندھن کے انبار پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔
وہ صحرا جس میں، میں ابھی تک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ماں پانی کی تلاش میں چکراتی پھر رہی ہے،
اور وہ اندھا کنواں جس میں مجھے ڈالا گیا تھا اور وہ جیل جس میں، میں اس وقت قید ہوں،
اور وہ جنگل جس میں مجھے اپنے بن باس کے سارے دن گزارنے ہیں، سب اس ایندھن کے حصار میں آ گئے ہیں۔ ایندھن کے اس حصار کی دوسری طرف میرے سوتیلے عزیز جشن منا رہے ہیں، میری تضحیک کر رہے ہیں، قہقہے برسا رہے ہیں۔ اور وہ لمحہ قریب آ تا جا رہا ہے جب وہ اس ایندھن میں نفرت کی آگ لگائیں گے۔ آگ چاروں طرف پھیل جائے گی۔ تب یہ صحرا، یہ اندھا کنواں، یہ جنگل اور میں ... میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے۔ اور میرے سوتیلے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔ تب میرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق میری تاریخ لکھیں گے، تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:
میں بدکار تھا اور میری بیوی بھی بدکار تھی اور میری ماں لونڈی تھی.. مگر میرا باپ؟

☆☆

میں پھر سوچنے لگتا ہوں
میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ ابراہیم کا بیٹا ہوں۔
اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں، ابراہیم کا پوتا ہوں۔
اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔ میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔
میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں۔۔ چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے۔ کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔
میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔
میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔
میں آل ابراہیم سے ہوں۔
آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔
''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''
یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔
مجھے جس اندھے کنوئیں میں گرایا گیا تھا آسمان سے اس میں اتنا پانی اترے گا کہ وہ کنواں چھلک پڑے گا اور بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا پانی سیلاب بن جائے گا۔
اور پھر سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ایندھن میں بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی ساری آگ بجھ جائے گی۔

☆☆

میرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگا دی ہے۔ اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ سوتیلے جذبوں کی آگ..... مگر میں دیکھتا ہوں کہ:
میرے بن باس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ میرا حق میرا تخت مجھے مل گیا ہے اور میری بیوی کی پاک دامنی کی شہادت خود تاریخ دے رہی ہے۔
میں دیکھتا ہوں کہ:
میری قید کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ اور میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز کیا گیا ہوں۔
اور چاند سورج اور ستارے میرے حضور سجدہ ریز ہیں۔
اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں میرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے۔ مری ماں کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔ اور ہزاروں برس سے میرا انتظار کرنے والی کنواریاں، میرے گلے میں ڈالنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار سجائے میری آمد کے گیت گا رہی ہیں۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحرِ ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی، آسمان سے اندھے کنوئیں میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور میری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی.....سب میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔

سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے اور اس آگ کے دوسری طرف میرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔

میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح میرے سامنے پیش ہوں گے۔

اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

"لا تثریب علیکم الیوم.....''☆

☆ترجمہ: آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

افسانہ

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

حیدر قریشی

خواہش تھی کہ اک بار کبھی خود سے بھی ملتے
فرصت کبھی اے گردشِ حالات عطا کر

جرمنی کی مصروف ترین زندگی میں معمولاتِ زندگی مشینی انداز سے گزر رہے ہیں۔ مجھے نہ صرف بہت سارے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہ ہو سکنے کی حسرت رہتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو خود سے ملنے کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے۔لیکن یہاں مکروہاتِ دنیا سے یا معمولاتِ زندگی سے مہلت ہی نہیں مل رہی۔ مجھے اتنا اندازہ ہے کہ میرے اندر میرے باہر سے زیادہ بہتر، کچھ ہے۔لیکن جہاں بدن کے تقاضوں سے ہی جان نہ چھوٹ رہی ہو وہاں اندر کی طرف دھیان کہاں جا سکتا ہے۔

ڈیوٹی پر آنے جانے سمیت دس گھنٹوں کی مشقت کے بعد ساڑھے نو بجے شب کو گھر پہنچتے ہی پہلے لباس تبدیل کرتا ہوں، باتھ روم سے فارغ ہوتا ہوں۔ پھر انٹرنیٹ پر آئی ہوئی ای میلز دیکھتا ہوں اور ان کے جواب لکھتا ہوں۔ دس بجے شب ٹیلی کاسٹ ہونے والے جیو ٹی وی کے خبرنامہ کے پہلے پندرہ بیس منٹ کی خبریں دیکھنا میرا معمول ہے اور اسی دوران ہی رات کا کھانا کھاتا ہوں۔کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر سیر کرنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ دس منٹ کی سیر کے بعد واپس آ کر مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھتا ہوں۔ گیارہ بجے کسی اہم ٹاک شو کو دیکھتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ہی صوفے پر سو جاتا ہوں۔صبح فجر کی نماز کے وقت پر جاگ جاتا ہوں۔ حوائجاتِ ضروریہ کے بعد نماز، قرآن کی بچپن کی پڑی ہوئی عادت پوری کرتا ہوں۔ اس دوران بیوی بچے بھی جاگ جاتے ہیں۔سب اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ بیوی ناشتہ تیار کرتی ہے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر میں کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہوں۔

دس بجے کے لگ بھگ جاگ کر تازہ دَم ہوتا ہوں۔ کچھ وقت انٹرنیٹ پر گزارتا ہوں۔ پھر ملازمت پر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے والی بس مجھے میرے گھر کے پاس سے مل جاتی ہے۔ بس پر بیٹھ کر اپنے شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے مجھے فرینکفرٹ شہر تک جانا ہوتا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر۳ پر فرینکفرٹ جانے والی ٹرین آتی ہے جبکہ پلیٹ فارم نمبر۲ پر فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آتی ہے۔ میں سیڑھیوں کے قریب اپنی ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ میری ٹرین سے تین منٹ پہلے فرینکفرٹ سے ٹرین آجاتی ہے اور اس کے آگے جانے تک میری اپنی ٹرین پہنچ جاتی ہے۔ میں اپنی ٹرین کے آگے والے ڈبے میں بیٹھا کرتا ہوں کہ وہاں سے مجھے اپنی اگلی منزل کی طرف جانے میں چند قدموں کے چلنے کی بچت ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے چونکہ میں فرینکفرٹ جانے والی ٹرین کے پہلے ڈبے کے مقام پر کھڑا ہوتا ہوں، اس لئے فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب آکر رُکتا ہے۔ یوں میں تین منٹ کے عرصہ میں اس ٹرین سے اترنے والی سواریوں کو سرسری سا دیکھ لیا کرتا ہوں۔ ہم سب آنے اور جانے والے مزدور اور دفتر پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقریباً سارے چہرے عام طور پر جانے پہچانے سے ہوتے ہیں۔ ایک دن میں نے معمول کے مطابق فرینکفرٹ کی طرف سے آنے والی سواریوں کو دیکھنے کی بجائے ویسے ہی اپنے پلیٹ فارم پر اپنی ٹرین کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا چھوٹا بیٹا تھا جو طبیعت تھوڑی سی خراب ہونے کی وجہ سے دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔ اس کو ڈاکٹر سے فوری رجوع کرنے کی ہدایت کرنے کے باوجود مجھے اپنے بیٹے سے اس طرح کی اچانک ملاقات خوشگوار سی لگی۔ اور پھر عجیب سا معاملہ ہوا۔ تب سے جب بھی میں فرینکفرٹ کی طرف جانے والی ٹرین کے لئے جاتا ہوں، فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو صرف اس وجہ سے دیکھتا ہوں کہ شاید میرا چھوٹا بیٹا پھر اس ٹرین سے اترے۔ ایک بار سنیچر کا دن تھا۔ آفس میں چھٹی کے باعث بیٹا گھر پر ہی تھا لیکن مجھے اپنے اولڈ ہوم میں معمول کے مطابق کام پر جانا تھا۔ میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح بیٹے سے بھی ہاتھ ملا کر اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔ لیکن شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر جیسے ہی فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آئی، میں اس طرح اسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے میرا بیٹا اُترے گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بیٹا تو گھر پر ہے، میں کس کا انتظار کر رہا ہوں! اب بیٹے نے اپنی کار لے لی ہے اور وہ کار پر ہی آفس آتا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی ہر بار فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو ایسے دیکھتا ہوں جیسے میرا چھوٹا بیٹا اس میں سے اترے گا اور میں اس سے ہونے والی ہلکی سی ملاقات کی خوشگواری کو محسوس کروں گا۔ جاب پر جا کر سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔

پچھلے دنوں جرمنی کی سب سے زیادہ مالیت ۳۵ ملین یورو کی لاٹری کے بخار نے پورے جرمنی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لاٹریوں کے چکر میں نہ پڑنے کے باوجود ۳۵ ملین اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے بھی اسے کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ خاص دعائیں پڑھ کر حصہ لے لیا۔ ۳۵ ملین یورو کا مطلب ہے ساڑھے تین کروڑ یورو۔ اور اس رقم کو پاکستانی مالیت میں تبدیل کیا جائے تو پونے تین ارب روپے بنتے ہیں۔

لاٹری کھیلنے کے بعد میں نے اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے بہت سارے منصوبے بنا لئے تھے۔ جرمنی میں ہی ایک بڑا رہائشی منصوبہ، جس میں میرے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں ایک ساتھ ہوں گے۔ جرمنی میں ایک کمپنی کا قیام اور پاکستان اور انڈیا میں اس کمپنی کی طرف سے انویسٹمنٹ کے پروجیکٹس۔ بچوں کے لئے ان کے ذہنی میلانات کے مطابق جرمنی میں مناسب کاروبار۔ پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں کے آس پاس ایک بڑی حویلی کی تعمیر۔ پھر بہت سارے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے لئے بعض منصوبے، جن کے مطابق انہیں مالی امداد دینے کی بجائے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا کرنے کے منصوبے شامل تھے۔ اسی طرح بعض فلاحی پروگرام شروع کرنے کے خاکے۔ بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آ گئی تھیں اور میں نے خود کو ذہنی طور پر ان ساری ذمہ داریوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔ جس دن شام کو قرعہ اندازی ہونا تھی اس دن میری معمول کی تلاوت کے دوران سورۃ انفال کی آیت **انما اموالکم واولادکم فتنۃ** نے مجھے ہلکا سا جھٹکا لگایا۔ یہ آیت آج کے دن ہی کیوں پڑھنے میں آئی اور پڑھتے وقت اتنی توجہ کیوں کھینچ گئی؟ لیکن پھر میں نے اسے ایک اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

قرعہ اندازی کا شفاف عمل ٹی وی پر میں نے اور میرے بیٹے نے براہِ راست ایک ساتھ دیکھا۔ میرا بیٹا کافی جذباتی ہو رہا تھا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر انعام نکل آئے تو تب بھی اپنی حیثیت سے باہر نہیں ہونا۔ انعام

نہیں نکلتا تو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں خود کو نارمل رکھنا ہے۔ قرعہ اندازی ہوئی تو ہمارا انعام نہیں نکلا۔ ۳۵ ملین کا انعام کسی اور کو مل گیا۔ بیٹا میرے سمجھانے کے باوجود کافی افسردہ ہوا۔ میں اسے تسلی دیتا رہا۔ مجھے لاٹری کا بڑا انعام حاصل نہ کر پانے کا افسوس نہیں تھا لیکن اپنے کئی منصوبوں کے ادھورے رہ جانے کی تھوڑی سی حسرت دل میں ضرور ہونے لگی تھی۔ انعام نکل آنے کی صورت میں اگلے دن میں نے اپنی مزدوری والی جاب پر نہ جانے کا طے کر لیا تھا۔ انعام نہیں نکلا تو اگلے دن میں معمول کے مطابق اپنی جاب پر چلا گیا۔ جاب سے واپسی پر روز کے معمولات سے گزرتا ہوا، رات کا کھانا کھا کر چند منٹ کی سیر کے لئے نکلا۔

اپنے گھر کے قریب کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے عجیب سی روشنی محسوس ہوئی، سٹریٹ لائٹس سے بالکل مختلف، جیسے مستقبل کے کسی دَور کی کوئی روشنی ہو۔ اسی روشنی میں یکا یک ایک نوجوان دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے ایک بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے کہا اس میں ۳۵ ملین یورو مالیت کے قیمتی ہیرے اور سونے کے بسکٹ ہیں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ آپ اسے لے لیں، میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہوا۔ اور پھر وہ نوجوان آناً فاناً غائب ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے میرے سارے منصوبے پورے کرنے کے لئے خدا نے کوئی آسمانی مدد بھیج دی ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دَم تیز ہو گئی۔ میں اپنی سیر کو ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف واپس پلٹا لیکن ابھی میں اپنی بلڈنگ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ سائرن بجاتی ایک پولیس کار میرے قریب آ کر رُک گئی۔ پولیس والے مجھ سے اُسی نوجوان کی بابت پوچھ رہے تھے لیکن میرے جواب دینے سے پہلے ہی اُن کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر پڑ گئی۔ تب مجھے بائبل کی ایک آیت یاد آئی:

''ہم سونے کو آگ سے اور انسان کو سونے سے آزماتے ہیں''

پولیس مجھے گرفتار کر رہی تھی، اسی لمحے مستقبل کے کسی دَور جیسی عجیب سی روشنی غائب ہو گئی اور میں نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف پولیس نے ایک نوجوان کو گرفتار کیا ہوا ہے۔ اس کا بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے۔ وہ نوجوان بالکل وہی تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنا بریف کیس دے گیا تھا۔ لیکن اب نہ تو میرے پاس کوئی بریف کیس تھا اور نہ ہی پولیس نے مجھے کوئی ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔ تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرا، یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا میں نے کوئی کشفی نظارہ ساد یکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آ سکی تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔ گھر سے باہر نکلا تو گہرے بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ ہیٹرس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویزبادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ آ رہی ہے۔ دھندلی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔ اس دوران فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔ فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔ لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے، میری مسکراہٹ، حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔ میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔ لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آباؤ اجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔ اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آ رہی ہے۔ دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آ چکی تھی، وہ دراصل اب آ رہی ہے، ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے میں سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

☆☆☆

سفرنامہ

پہلا عمرہ

حیدر قریشی

روایت ہے کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ قبول کر لی جاتی ہے۔ اس چھوٹے سے سفر کے دوران مجھے حضرت علیؓ سے لے کر امام ابوحنیفہؒ تک کئی بزرگان امّت کی باتیں یاد آتی رہیں۔ کہیں میری رہنمائی کرنے والی اور کہیں دل کی گرہیں کھولنے والی باتیں.....مبارکہ کو میں نے بتا دیا تھا کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی اپنی اہم ترین دلی مراد کے لئے دعا مانگ لینا۔ دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہم ''باب الملک فہد'' سے گذرنے لگے۔ جیسے ہی خانہ کعبہ کی پہلی جھلک دکھائی دی میں نے اپنی دعا مانگ لی۔ بعد میں جب میں نے مبارکہ سے پوچھا کہ آپ نے کیا دعا مانگی تھی؟ تو جواب ملا اپنے بچوں کے لئے دعا مانگی تھی۔ پھر مبارکہ نے مجھ سے میری دعا کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے بتایا کہ میں نے صرف اتنی دعا مانگی ہے ''الٰہی! مجھے مستجاب الدعوات بنادے'' مبارکہ نے اس کا مطلب پوچھا تو میں نے کہا یوں سمجھ لیں کہ الٰہی میں جب کوئی دعا مانگوں اسے قبول کر لیا کرنا.....مبارکہ ہنس پڑی اور کہنے لگی آپ نے اللہ میاں کے ساتھ چالاکی کر لی ہے.... میں نے کہا اگر یہ چالاکی ہے تو امام ابوحنیفہؒ بھی بہت پہلے یہی دعا مانگ چکے ہیں..... اب میں نے بھی یہ دعا مانگ لی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ہم مطاف تک پہنچے تو خانہ کعبہ کا جاہ وجلال اپنا اثر دکھانے لگا۔ سامنے رکن یمانی تھا۔ جاتے ہی پہلے اسے بوسہ دیا۔ وہاں سے حجر اسود کی طرف بڑھے اور مخصوص دعاؤں کے ساتھ وہاں سے طوافِ کعبہ کا آغاز کیا۔ پہلے چکر ہی میں نہ صرف میں نے خود حجر اسود کو بوسہ دیا بلکہ مبارکہ کو بھی کھینچ کھانچ کر وہاں تک لایا اور اس نے بھی بوسہ کی سعادت حاصل کر لی۔ اس وقت جب یہ احوال تحریر کر رہا ہوں تو مجھے حضرت عمرؓ کے الفاظ یاد آ رہے ہیں جن کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اے حجرِ اسود! میرے نزدیک تو صرف ایک پتھر ہے لیکن میں تجھے اس لئے بوسہ دے رہا ہوں کہ میرے آقا حضرت محمدؐ نے تجھے بوسہ دیا تھا۔--- پر سچی بات ہے اُس وقت مجھے کسی ایسی بات کا ہوش نہ تھا۔ بس گرتے پڑتے، جیسے تیسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دُھن تھی۔ اس دھن میں مجھ سے تھوڑی سی ''ہیٔ مانی'' بھی ہوگئی۔ دو تین لائنیں بنا کر لوگ باری باری بوسہ دے رہے تھے کہ ان لائنوں میں سے ایک دو اور ضمنی لائنیں نکل آئیں۔ یوں افراتفری سی پیدا ہوگئی اور مجھے اس افراتفری سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل گیا۔ میں اپنے دائیں، بائیں اطراف والوں کو تھوڑا تھوڑا سا دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور حجر اسود پر سر اور ہونٹ رکھ دیئے۔ اُس افراتفری کو یاد کرتا ہوں تو اب اندازہ کر سکتا ہوں کہ قیامت کے دن بھی ایسی نفسا نفسی ہوگی۔ اگر وہاں بھی میرے جیسے گنہگار اسی طرح منزل مراد پا گئے اور دنیا میں جنت کے ٹھیکیدار اور دعویدار ویسے ہی لائن حاضر رہ گئے تو کیا ہوگا۔

رند بخشے گئے قیامت کو
شیخ کہتا رہا حساب حساب

سات چکر پورے کرنے کے بعد خانہ کعبہ کے دروازہ (ملتزم) کے سامنے دو نفل پڑھے۔ مخصوص دعاؤں کے ساتھ اپنی دلی دعائیں کیں، خدا کے بے پایاں احسانات کا شکر ادا کیا۔ پھر تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر مقامِ ابراہیم کے پاس دو نفل ادا کئے۔ وہاں بھی دعاؤں کی توفیق ملی۔ پھر آبِ زم زم پیا۔ حجر اسود کے سامنے حاضری دی۔ دور سے بوسہ دیا اور ''الصفا'' گیٹ سے گذر کر کوہ صفا تک پہنچے۔ سعی کی نیت کی، تہلیل وتکبیر پڑھی اور سعی شروع کی۔ مروہ کی طرف جاتے ہوئے مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو اس وادیٔ غیر ذی ذرع میں چھوڑ جانا یاد آیا، پھر بھوک، پیاس اور تنہائی کا خوف....حضرت اسماعیل کا تڑپنا اور حضرت ہاجرہ کی بے تابی....کبھی صفا کی چوٹی پر جا کر کسی امدادی قافلے کی راہ دیکھنا اور کبھی دوسری سمت دوڑ کر جانا اور مروہ کی چوٹی سے کسی قافلے کی راہ تکنا.... ہزاروں برس پہلے کے اس مکہ کے ویران بیابان اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو درپیش دردناک اور خوفناک صورتحال کو جیسے لفظوں میں چاہیں بیان کر لیں، اُن دونوں کے دُکھ درد کی کیفیات کی ترجمانی ہو ہی نہیں سکتی۔ بس ان کیفیتوں کو ایک حد تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سعی کے سات چکروں کے دوران مجھے بار بار بی بی ہاجرہ کی تڑپ اپنے سینے میں محسوس ہوتی رہی اور اسی حالت میں دل سے دعائیں نکلتی

رہیں۔ میرے اندر کے صحرا میں میرے آباء واجداد کے آباء واجداد کے جدِّ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی برکت سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ دل کا اور آنکھوں کا رابطہ ہو گیا تھا۔ میرے اندر کے صحرا کی سلگتی ہوئی ریت سیراب ہونے لگی تھی۔

مروہ کی طرف ساتواں چکر پورا ہوتے ہی ہمارا عمرہ مکمل ہو گیا (الحمد للہ)۔ عمرہ مکمل ہونے پر کسی سائڈ سے تھوڑے سے بال کاٹنے ہوتے ہیں۔ اسے بال ترشوانے کی علامت کہہ سکتے ہیں۔ وہاں بعض خواتین اس کارِ خیر کی تکمیل کے لئے ہاتھ میں قینچیاں لئے کھڑی تھیں۔ ان سے قینچی لے کر میں نے مبارکہ کے تھوڑے سے بال کاٹے اور مبارکہ نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے تھوڑے سے بال کاٹے۔ قینچی واپس کرتے وقت اس خاتون کو ایک ریال بطور ہدیہ یا عطیہ نذر کرنا پڑا۔ (اگلے دن پھر ہم نے اپنی قینچی خرید لی)۔

عمرہ مکمل ہونے کے بعد ہم ''زم زم کا کنواں'' دیکھنے کے لئے نیچے کی طرف گئے انڈر گراؤنڈ حصے میں چھوٹی چھوٹی ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی زنجیر سے بندھے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ یہ 'محبت کی زنجیر' تھی تا کہ 'مشترکہ محبت' کو کوئی ایک عاشق اپنی ذاتی ملکیت نہ بنا سکے۔ ایک کمرہ میں ایسے لگا کہ چشمہ کا منبع وہاں ہوگا۔ وہاں گئے تو بھاری بھرکم پمپ لگے ہوئے دیکھے۔ پہلے تو خیال آیا کہ مشینوں نے دلوں سے بڑھ کر مذہبی شعائر پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے لیکن پھر سوچا کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں ہمہ وقت آتے چلے جانے والے لاکھوں پروانوں کو پانی کی فوری اور عمدہ فراہمی کے لئے ایسا کرنا بے حد ضروری تھا۔ زم زم کے پمپ کو دیکھ کر باہر نکلا تو میں نے باہر سے چشمہ کی طرف جانے والے رستے کی طرف غور سے دیکھا۔ ہائیں۔ یہ سامنے بورڈ پر کیا لکھا ہے؟ میں نے عینک اتار کر اس کے شیشوں کو صاف کیا۔ آنکھوں کو مل کر دیکھا۔ کہیں مجھے نشہ تو نہیں ہو گیا۔ وفورِ شوق کا نشہ، جس نے طویل سفر کے بعد آرام کرانے کی بجائے دربارِ کعبہ میں لا کھڑا کیا تھا.... بورڈ پر تین لائنوں میں زم زم کا نام لکھا تھا۔

پہلی لائن: بئر زم زم،

دوسری لائن: Zam Zam،

تیسری لائن: زم زم کا کنواں

تیسری لائن میں اردو عبارت دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ میں تو بئر زم زم کے الفاظ سے ہی سرور حاصل کرنے لگا تھا۔ ایک دوست یاد آ گئے جو کہا کرتے ہیں کہ بئر شراب نہیں ہوتی۔ غالبؔ یاد آ گئے:

رات پی زم زم پہ مئے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

کہیں ایسا نہ ہو کہ جنت میں ملنے والی موعودہ شراباً طہورا بھی بئر زم زم سے ملتی جلتی کوئی چیز ہو....چلیں خیر ہے۔ مجھے اس سے کیا، یہ تو جنتی لوگوں کا مسئلہ ہے۔ میں ازلی گنہگار....نہ جنت میرا مسئلہ نہ شراباً طہورا کا لالچ....چشمۂ زم زم کے خواتین والے حصہ سے مبارکہ باہر آئی تو میں نے اسے ''بئر زم زم'' کے الفاظ دکھائے۔ اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ایسی چیزیں کہیں بھی ہوں لپک لپک کر آپ تک پہنچ جاتی ہیں۔

یہاں سے ہم حطیم کعبہ میں گئے۔ وہاں دو دو نفل ادا کئے۔ من کی مرادیں مانگیں۔ پھر حطیم والی طرف سے ''باب الملک فہد'' کی طرف جانے والے رستے کی ایک صف میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے:

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دُکھ تینوں نئیں دَسنا

لگ بھگ دو گھنٹے تک دیدارِ کعبہ سے آنکھیں روشن کرتے رہے۔ اس دوران چند نوافل بھی وقفے وقفے سے پڑھتے رہے۔ میرے سامنے کعبہ شریف کی دو دیواریں تھیں۔ ایک حطیم کے طرف والی۔ یہ آدھی سے زیادہ دکھائی دے رہی تھی، دوسری حطیم کے دائیں طرف والی جو رُکن شامی سے رُکن یمانی تک بالکل سامنے تھی۔ حجر اسود، رُکن عراقی اور ملتزم دوسری طرف تھے۔ حطیم میں میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا لیکن اب یہاں سے بیٹھے ہوئے پہلی بار خانہ کعبہ کا سنہری پرنالہ دکھائی دیا۔ حطیم کی طرف خانہ کعبہ کا یہ وہی پرنالہ ہے جس کے نیچے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کی قبریں تھیں۔ یہ روایت پرانی عربی کتابوں سے لے کر اُردو میں اہل سنت و الجماعت کے مسلک کی کتابوں تک میں مذکور ہے جبکہ ''موحدین'' قسم کے فرقے اس روایت کی تردید کرتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں۔ اس جگہ کو میزاب الرحمت کہا جاتا ہے۔ میزاب، پرنالے کو کہتے ہیں۔

تعمیر کعبہ کی مختلف پرانی تاریخیں میں نے ایک زمانے میں پڑھی تھیں۔ عربی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی طاہر الکردی کی کتاب بھی ان میں شامل تھی اور راولپنڈی سے اہل سنت والوں کی جانب سے شائع کردہ ایک

کتاب بھی شامل تھی۔مختلف تواریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اب خانہ کعبہ ہے یہ دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں اس گمشدہ مقام کی از سرِ نو دریافت ہوئی اور تعمیر ہوئی۔ایک بار جب حضرت ابراہیم مکہ تشریف لائے تو بی بی ہاجرہ فوت ہو چکی تھیں۔تب حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو ساتھ لے کر ان کی قبر کے گرد ایک بڑا سا احاطہ بنا دیا جو صرف پتھروں پر پتھر رکھ بنایا گیا۔اس میں گارے کا استعمال نہیں ہوا۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام فوت ہوئے تو انہیں بھی ان کی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ان قبروں والی جگہ کو میزاب الرحمت کہا جاتا ہے۔دراصل اسلام سے پہلے بھی کعبہ شریف کی حدود کو کبھی گھٹانے اور کبھی ابراہیمی بنیادوں پر قائم رکھنے کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے، آپؐ کی حیات مبارکہ میں بھی ایک بار تعمیرِ کعبہ ہوئی تھی۔تب حجرِ اسود کو اصل مقام پر نصب کرنے کا سنگین قبائلی بحران حضور ﷺ نے نہایت عمدگی سے دور کر دیا تھا۔ عام روایت ہے کہ تب تعمیرِ کعبہ کے لئے قبائل کے رزقِ حلال سے جو چندہ جمع ہوا تھا، اس سے کعبہ شریف کی دیوار ابراہیمی بنیادوں تک نہیں لے جائی جا سکتی تھی چنانچہ حطیم کا حصہ چھوڑ دیا گیا۔تاہم تب بھی اور اب بھی طواف کعبہ کے لئے حطیم شریف کے اوپر سے چکر لگانا ضروری ہے۔کیونکہ حطیم، کعبہ کا حصہ ہے۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے خانہ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کرائی تھی۔یہ تعمیر ابراہیمی بنیادوں پر کی گئی۔حطیم بھی کعبہ کے اندر آ گیا لیکن جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شہید کرا دیا تب خانہ کعبہ کی ابراہیمی بنیادوں کو ختم کر کے اس کی تعمیر پھر انہیں بنیادوں پر کرا دی جیسی کفارِ مکہ نے حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کی تھی۔یوں حطیم اور میزاب الرحمت پھر دیوارِ کعبہ سے باہر ہو گئے۔

۔۔۔۔خدا کے بارے میں دو بڑے تصوّر مختلف صورتوں میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ایک تصوّر انوار پرستی کا اور دوسرا ارض پرستی کا۔ارض پرستی سے زمین کے درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، بعض جانوروں اور بتوں کو مقدّس مانا گیا اور انوار پرستی سے سورج، چاند، ستاروں اور آگ کی پرستش کو رواج ملا۔ اصل میں تو یہ سارے تصورات اور عقائد خالقِ کائنات کی جستجو کے سفر ہیں۔بس۔ 'سفرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست'۔اسلام نے اللہ کو آسمانوں اور زمین کا نور کہہ کر اسے روشنی کے عام مظاہر سے ارفع قرار دیا دوسری طرف بت پرستی کو ختم کر کے خانہ کعبہ کو زمینی مرکز بنا دیا یوں اسلام نے انوار پرستی اور ارض پرستی کے مروجہ تصورات سے ہٹ کر ایسا معتدل تصور عطا کیا جو خالق کائنات کے بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کرتا ہے۔

اسلام سے پہلے مکہ میں حنفا کا ایک فرقہ موجود تھا۔یہ بت پرستی اور قبر پرستی نہیں کرتا تھا ممکن ہے ابراہیمی حدودِ کعبہ سے حطیم شریف کو بار بار باہر کرنے میں شعوری یا لاشعوری طور پر یہ سبب بھی رہا ہو کہ مذکورہ قبروں کے تعویذ ختم کر دیئے جانے کے باوجود بعض ''موحد'' قسم کے قبائل کو قبر پرستی کا احساس ستاتا رہا ہو۔فکر کی متضاد لہریں بھی تو ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور غیر محسوس طریقے سے ایک ساتھ ارتقائی سفر بھی کرتی چلی جاتی ہیں۔

حطیم کو کعبہ کی دیوار کے اندر رکھا جائے یا باہر.....وہ بہر حال کعبہ شریف کا حصہ ہے۔اس حصے میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے مدفون ہونے سے کم از کم مجھے تو کوئی الجھن محسوس نہیں ہوتی کیونکہ میں جب کعبہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتا ہوں تو میرا سجدہ اس عمارت کے لئے نہیں بلکہ خدا کے حکم کی فرمانبرداری کے لئے ہوتا ہے۔آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ کرنا بھی درحقیقت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں تھا بلکہ خدا کے حکم کو سجدہ کرنا تھا۔اسی طرح کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اور سجدہ ریز ہونا، نہ حقیقتاً بی بی ہاجرہ کی قبر کے لئے ہے، نہ حضرت اسماعیل کی قبر کے لئے ہے اور نہ ہی کسی اور کے لئے....یہ تو بس خدا کے حکم کو سجدہ ہے اور اس کے حکم کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔

دیدارِ کعبہ کے دوران ہی تہجد کی اذان ہوئی۔ہم نے تہجد کی نماز پڑھی پھر فجر کی اذان ہوئی، نماز باجماعت ادا کی۔صبح ۷ بجے تک ان عبادات سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں واپس آ گئے۔کل دن بھر کے سفر اور رات بھر کی بیداری کے باوجود نیند کا غلبہ نہیں تھا پھر بھی سونے کی کوشش کی۔سات سے گیارہ بجے تک تھوڑی بہت نیند پوری کی۔جاگ کر کھانے کا انتظام کیا، کھانا کھایا اور تیار ہو کر ظہر کی نماز کے لئے حرم شریف چلے گئے۔اس بار میں ''باب الملک فہد'' کے بالکل سیدھ والے رستے سے گذر کر مطاف سے باہر کی ایک صف پر قبلہ رُو تھا۔اب صرف خانہ کعبہ کی سامنے والی دیوار روبرو تھی۔اس کے دائیں جانب رُکن یمانی اور بائیں جانب رُکن شامی اور حطیم تھا۔حطیم کی جانب والی دیوار یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی البتہ پرنالہ بڑی حد تک دکھائی دے رہا تھا۔ دمکتے ہوئے سنہری پرنالے نے میری آنکھوں میں چمک پیدا کر دی تھی۔ظہر کی

نماز کی ادائیگی کے بعد ہم لوگوں نے تھوڑی سی خریداری کی۔ مبارکہ نے جرمنی کے موسم کے مطابق گرم اوورکوٹ پہنا تھا جسے میقات پہنچنے تک اتارنا پڑ گیا۔ میں نے اسے اپنی لمبی جیکٹ دے دی۔ یہ زیادہ گرم نہیں تھی لیکن مکّہ کے موسم کے لحاظ سے یہ بھی خاصی گرم تھی۔ چنانچہ مارکیٹ میں جا کر پہلے تو مبارکہ کے لئے ایک برقعہ خریدا۔ مبارکہ کو برقعہ اتنا اچھا لگا کہ اس نے رضوانہ کے لئے بھی خرید لیا۔ بعض دوسرے عزیزوں کے لئے بھی مختلف تحائف اور تبرکات لئے۔

آج (۲ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو) مکہ میں جرمن مارک کی قیمت ۲.۴۱ ریال تھی۔

☆☆☆

خاکہ

برگد کا پیڑ

(اباجی)

حیدر قریشی

گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک روح میں مہکار کا احساس باقی ہے

باپ بیٹے کے مابین اوّلین تعارف کا کوئی واقعہ بیان کرنا اس لحاظ سے بے معنی سی بات ہے کہ یہ تعارف تو خون کے اجزا میں سے ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل ہے۔ صدیوں پہلے ہم اپنے آباؤ اجداد کے لہو میں موجزن تھے۔ اپنی پیدائش سے پہلے میں اباجی کے لہو میں رواں تھا تو اباجی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں۔ اس کے باوجود شعوری سطح پر اباجی سے میرا پہلا معانقہ اس وقت ہوا جب میری عمر تقریباً تین سال تھی۔ یہ واقعہ آج بھی میرے شعور میں ایک ہیولے کی طرح موجود ہے۔ یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی موقعہ ملتا الاسٹک والی نیکر اور پچ بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس پہن لیتا۔ ایسا ایک موقعہ مجھے اُس وقت ملا جب امی جی سامنے والے گھر کی بُوا زبیدہ کے ہاں گئیں اور میں فطری لباس پہنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ رحیم یار خاں کے محلّہ قاضیاں سے (موجودہ) جدید بازار تک کئی پیچ دار رستوں سے نجانے میں کس طرح گزرتا چلا گیا۔ اباجی وہاں اپنے ایک دوست ممتاز صاحب کی دوکان پر کھڑے تھے۔ میں جا کر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے سمجھا کسی کا بچہ ہے جو خوامخواہ ان سے چمٹ گیا ہے۔ چنانچہ میرے معانقہ کے جواب میں انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے اپنے سے الگ کر کے پرے کر دیا۔ میں پھر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اس بار پھر انہوں نے دیکھے بغیر مجھے پرے دھکیل دیا اور میں اپنے حواس درست کئے بغیر تیسری بار پھر ''ابوا'' کہہ کر ان کی ٹانگوں سے معانقہ کرنے لگا۔ لیکن اب اس سے پہلے کہ اباجی مجھے پھر پرے دھکیلتے ممتاز صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے حیران ہوتے ہوئے اباجی سے کہا: قریشی صاحب! یہ تو حیدر ہے۔ اب جو اَباجی نے پلٹ کر دیکھا تو میری میلی کچیلی، ننگ دھڑنگ حالت ہی میں مجھے اٹھا لیا۔ پھر سب کچھ بھول بھال کر گھر کی طرف چل دیئے۔ راستہ بھر بار بار مجھے خود سے لپٹاتے اور چومتے جاتے۔ گھر پہنچے تو وہاں میری گمشدگی پر کہرام برپا تھا، یہ اباجی سے گویا شعوری سطح پر میرا پہلا تعارف تھا۔

اباجی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج اباجی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام میں دراوڑ حاوی رہا۔ عالم شباب میں نواب بھاولپور تک رسائی حاصل کر کے انہیں بھاولنگر محکمہ پولیس میں محرر لگوایا گیا جب سارا سامان باندھ کر روانہ ہونے کا وقت آیا تو داداجی نے دبی زبان سے کہا: بیٹا!۔۔تو پھر جا رہے ہو؟۔۔اچھا جاؤ، ویسے دل نہیں کرتا کہ جاؤ۔

اباجی نے فوراً کہا: دل تو میرا بھی نہیں کرتا کہ جاؤں، اس لئے نہیں جاتا۔۔ یہ کہہ کر بندھا ہوا سامان کھول ڈالا۔

ابا جی نے یہ قصہ بڑے مزے لے کر ہمیں سنایا تھا اور پھر کہا تھا: بھئی ہم سرائیکی لوگ تو اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہی پردیسی ہو جاتے تھے۔ یہ واقعہ تقسیم برصغیر سے پہلے کا ہے۔ اگر ان پر ان کے اندر کا دراوڑ حاوی نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔۔ بعد میں جب خراب حالات بار بار حملہ آور ہونے لگے تو یوں لگا جیسے دراوڑ مغلوب ہو گیا ہے اور ابا جی کے اندر کا آریا فاتح ہو گیا ہے۔ رحیم یار خاں والا گھر فروخت کیا گیا تو ابا جی کے چہرے پر کوئی کرب نہیں تھا۔ میں تب صرف دس برس کا تھا مگر وہ گھر آج بھی نہ صرف میرے نہاں خانۂ دل میں آباد ہے بلکہ مجھے جب بھی رحیم یار خاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، اس گھر کو دیکھنے کے لئے ضرور جاتا ہوں اور وہاں دیر تک بچپن کی یادوں میں گھرا رہتا ہوں۔ خانپور والا گھر فروخت ہوا تو ابا جی کے چہرے پر کوئی اداسی نہ تھی۔ یوں ان کے اندر کا آریا فتح یاب ہو گیا۔ مگر دراوڑ مغلوب کہاں ہوا؟ اس نے بیوی بچوں کو دھرتی کا متبادل بنا لیا، ایک معمولی سی مدت کے علاوہ بیوی بچوں کو خود سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔

اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ ابا جی کے اندر موجود رہا۔ یہ درویش خواب بین، دعا گو اور صاحبِ کشف و کرامت تھا۔ عرب درویش کا کمال یہ تھا کہ نیل آرمسٹرانگ سے دس سال پہلے اس نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ ابا جی نے ۱۹۵۹ء میں خواب دیکھا کہ وہ چاند کی سرزمین پر اترے ہوئے ہیں۔ وہاں کے پہاڑ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے راکھ کے ہوں اور پاؤں رکھتے ہی راکھ میں دھنس جائیں گے۔ لیکن ابا جی پہاڑ پر پاؤں رکھتے ہیں تو وہ پتھر کے ہی ہوتے ہیں۔

Rain Makers اور Rain Breakers کے چند قصے تو اب پڑھنے کو ملے ہیں۔ مگر ابا جی کی ''وِل پاور'' اور ''ارتکاز'' کا کرشمہ تو ہم نے خود دیکھا تھا۔ ابا جی اور امی جی میں ''بزرگی'' کے مسئلہ پر مذاق چلتا رہتا تھا۔ ابا جی نے کہا: اگر میں اللہ میاں سے دعا کر کے اسی وقت بارش کروا دوں تو میری بزرگی کو مان لو گی؟۔۔ رحیم یار خاں میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بادلوں کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ اس لئے امی جی نے للکارتے ہوئے شرط منظور کر لی۔ ابا جی مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب چھت سے نیچے آئے، چاروں جانب سے گھنگھور گھٹائیں امڈی چلی آ رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لیکن امی جی نے ابا جی کی بزرگی کو نہیں ماننا تھا، نہیں مانیں۔

مریضوں پر دم کرنا اور کسی کی خاص غرض کے لئے خصوصی دعا کرنا ان کی روحانیت یا وِل پاور کا عام سا کرشمہ تھا۔ میری ایک بہن زبیدہ کو جب بھی بخار ہوا اور دوا سے فرق نہیں پڑا، ابا جی نے اسے بھینچ کر گلے سے لگایا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ میرے نزدیک ایسے متعدد واقعات کے باوجود ابا جی کی سب بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کو ہنسی خوشی گزار لیا۔ کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلر ماسٹر تک کا تکلیف دہ سفر طے کیا۔ پھر شوگر مل میں نوکری کر لی اور مجھے بھی شوگر مل میں جھونک دیا۔ جی سنز شوگر ملز خانپور کے جنرل منیجر عزیز حسین کی بیگم بڑی نیک دل خاتون تھیں (اگر ابھی تک زندہ ہیں تو اللہ انہیں مزید زندگی عطا کرے) ابا جی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ اپنے بہت سے خانگی معاملات ابا جی کو بتا کر ''دعا'' اور ''دوا'' دونوں کے لئے کہتیں۔ بیگم عزیز حسین کی نیکی کے سبب مجھے پندرہ (سولہ) برس کی عمر میں شوگر مل میں مزدوری مل گئی۔ میں نے اپنی زندگی کے بے حد قیمتی انیس سال اس شوگر مل میں برباد کئے۔ بیگم عزیز حسین کی نیک نیتی اور نیکی کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے لئے نیکی نہ کی ہوتی تو میں زیادہ بہتر حالت میں ہوتا۔

شوگر مل کی ملازمت کے حوالے سے ہی یاد آیا کہ ملز انتظامیہ کے مزدور دشمن رویے کے باعث مجھے ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑا۔ ملز میں تصادم ہوا۔ بعض اہم افسروں کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوئی۔ مقدمات بنے۔ اسی دوران مجھے بار بار دھمکیوں کے ساتھ خوشنما آفرز بھی ہوئیں مگر میں جوش جوانی اور بغاوت کی دُھن میں ہر آفر کو ٹھکراتا چلا گیا۔ ایک مرحلے پر ابا جی سے بھی کہا گیا کہ مجھے مفاہمت کے لئے راضی کریں۔ ابا جی نے مجھے بتایا کہ مجھے اس طرح کہا گیا ہے مگر تم جو فیصلہ اپنے طور پر کرنا چاہو، وہی کرو۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مفاہمت کا حکم دیتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ مگر انہوں نے کہا میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گا۔ تم خود فیصلہ کرو گے اور جو بھی فیصلہ کرو گے وہی درست ہو گا۔ چنانچہ میں نے مفاہمت کی بجائے بغاوت کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ سے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ابا جی اپنی وضع داری کی روایت پر تو قائم تھے مگر میرے باغیانہ رویے کو وہ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے۔ اسی لئے مجھے اس سے روکنے کے بجائے انہوں نے بالواسطہ میری حوصلہ افزائی کی۔ جب ہماری یونین کو معطل کرا دیا گیا تب ہم سے ملنے

والے ہر مزدور سے باز پرس کی جاتی تھی مگر اباجی کی اپنی شخصیت اتنی مضبوط تھی کہ نہ صرف انہیں ملز انتظامیہ کی طرف سے تنگ نہیں کیا گیا بلکہ ان کا اسی طرح احترام کیا جاتا رہا جیسا میری بغاوت سے پہلے ہوتا تھا۔

اباجی بتاتے تھے کہ ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بیٹوں کی کمی چلی آ رہی تھی۔ ایک بزرگ کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ ان بیٹوں میں سے ایک کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ ان میں سے بھی ایک کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ میاں میر محمد کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔ میاں سعید بے اولاد رہے۔ میاں غوث محمد کے ہاں ایک بیٹا ہوا مگر اگلے مرحلے میں ان کی نسل بھی ختم ہوگئی۔ میاں اللہ رکھا کے ہاں دو بیٹے ہوئے، باباجی اور اباجی۔۔ باباجی کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور اباجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

اباجی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی عزیز بی بی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لی کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ پھر اباجی کی شادی ہماری امی جی سے ہوئی اور یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔ پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔۔ عزیز بی بی نے دوسری جگہ شادی کر لی مگر اولاد سے محروم رہی۔

ایک دفعہ بواحیات خاتون ہماری چھوٹی بہن بے بی کو لے کر ایک رشتہ دار کے یہاں گئیں۔ وہیں اباجی کی پہلی بیوی آ گئی۔ بے بی کو دیکھتے ہی چونکی۔ اس کے استفسار پر بواحیات خاتون نے بتایا کہ قریشی غلام سرور کی بیٹی ہے۔ اسی وقت بے بی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ اباجی کی اولاد کی تفصیل پوچھی۔ بواحیات خاتون نے تفصیل بتادی۔ سن کر سارے بچوں کو درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگی اور پھر حسرت سے کہنے لگی مجھے میری زیادتی کی سزا مل گئی ہے۔۔ چند دنوں کے بعد اباجی کی پہلی بیوی کی طرف سے کھانے کی چند اشیاء کا تحفہ ہمارے گھر آیا۔ مگر اباجی نے ساری چیزیں تلف کرادیں۔ کسی کو چکھنے نہیں دیں ان کا خیال تھا کہ ان اشیاء پر کوئی منفی قسم کا دَم کیا گیا ہے۔۔ پہلی بیوی کی بے وفائی کے بعد اباجی کی امی جی سے شادی ہوئی تو دونوں کی عمروں میں بارہ سال سے زائد کا فرق تھا مگر اس بُعد نے محبت میں اضافہ کیا۔ اباجی اور امی جی کی محبت اور خوشگوار ازدواجی زندگی سارے خاندان کے لئے آج بھی ایک مثال ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے عزیزوں میں اباجی کا گھر سب سے زیادہ خوش حال تھا، پھر وہ وقت آیا کہ اباجی کا گھر انتہائی غربت کا شکار ہوگیا۔ بے حد قریب رہنے والے عزیز دور ہوگئے مگر اباجی کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اباجی بے حد قناعت پسند تھے مگر انہوں نے ہمیں کبھی قناعت کا درس نہیں دیا۔ دراصل وہ اس لئے سارے دکھ خوشی خوشی برداشت کر رہے تھے کہ پچھلی کئی پشتوں سے ''پل صراط'' پر چلتے ہوئے ان کے خاندان کو پانچ بیٹوں کو سنبھالا مل گیا تھا۔ حالانکہ یہ پانچوں بیٹے ان کے کسی کام نہ آ سکے۔ نہ کوئی خدمت کرنے کا اہل ہو سکا نہ کوئی خدمت کر سکا۔ ان کی اپنی ساری زندگی ہی مشقت کرتے گزر گئی۔

اباجی کو کبھی کبھی غصہ بھی آتا اور یہ غصہ عام طور پر گھر کے گھڑوں اور برتنوں پر اترتا تھا۔ لیکن جب شام کو اباجی گھر آتے، ان کے ایک ہاتھ میں نیا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کے ہار ہوتے اور جھگڑا ختم۔

۱۹۵۰ء میں اباجی اچانک بیمار ہوئے تھے۔ اس علالت میں عجیب و غریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔ باباجی کے بیان کے مطابق اباجی کو چار چار پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر اباجی اس طرح اٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ اباجی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا، اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا، حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔ اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ اباجی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہوگیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ ٹانگوں سے بالکل جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید (۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔ اباجی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری، جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا، میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی، دم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے اباجی نے یکے بعد دیگر دو خواب دیکھے تھے۔ پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اباجی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ خواب سن کر اباجی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو.....

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ اباجی نے اپنے مرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرمادیں۔ مرشد کو اباجی کے خواب کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے حیدر بنادیا۔ مگر اباجی کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ شاید حسنِ اتفاق تھا کہ میں پیدا ہو گیا اور حیدر نام رکھا گیا۔

میں بچپن میں شرارتیں بہت کرتا تھا۔ دوسروں کو ڈرانے میں مزہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے **بچپن میں اباجی سے بڑی مار کھائی۔ سب سے زیادہ مار بھی میں نے کھائی اور اباجی کی توجہ بھی سب سے زیادہ مجھے ملی۔ یہ اباجی کی ذاتی توجہ ہی تھی جس کے باعث اسکول میں داخلہ کے وقت مجھے کچی، پکی کی بجائے براہِ راست دوسری جماعت میں داخل کر لیا گیا۔ شادی کے بعد بھی ایک دفعہ اباجی سے تھپڑ کھایا۔ یوں تو والدین کی محبت ساری اولاد کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اباجی کو آپی سے اور مجھ سے سب سے زیادہ پیار تھا۔** زبیدہ کے لئے فکرمندی زیادہ رہی جبکہ اعجاز سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا رہا۔

موسیقی سے اباجی کو رغبت نہیں تھی لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک پرانا گانا ''ڈاچی والیا موڑ مہاروے'' سن کر کہتے یہ تمہارے دادا کو بہت پسند تھا۔ اباجی کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں پسند تھیں۔ عام طور پر تحت اللفظ کے ساتھ پڑھتے۔ کبھی کبھار اپنے آپ میں گنگنا بھی لیتے۔ عنایت حسین بھٹی کی آواز میں خواجہ صاحب کی کافی ''ساکوں سجناں دے ملن دی تانگ اے'' سن کر جھوم سے اٹھتے۔ انھی کی وجہ سے ہی شاید مجھے لوک گیتوں اور صوفیانہ شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ عموماً اباجی کے چہرے پر رہتی تھی۔ جملے باز نہیں تھے مگر اچھے جملے پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ ہنسی کی کسی بات پر اگر کھل کر ہنستے تو اتنا ہنستے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ ان کی اس کیفیت پر میرا جی کا شعر یاد آ گیا ہے:

نہیں گریہ و خنداں میں فرق کچھ بھی
جو ہنستا گیا دل تو روتا گیا دل

اباجی کی شخصیت کا جادو ایسا ہے کہ آج بھی رحیم یار خاں کے ان کے پرانے احباب سے ان کا ذکر کریں تو ان کی باتیں سناتے سناتے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ رحیم یار خاں کے پرانے محلے سے جا کر پتہ کریں تو اباجی کا نام سنتے ہی ان کے چہروں پر محبت کی چمک آ جاتی ہے۔ میں تقریباً دس سال کے بعد پہلی دفعہ پرانا مکان دیکھنے گیا تو نہ صرف اڑوس پڑوس کے سارے لوگ جمع ہو گئے بلکہ اتنی محبت سے اپنے گھروں میں لے گئے کہ میں ان محبتوں پر حیران رہ گیا۔ گھر کی لڑکیوں، عورتوں میں سے کسی نے پردہ نہ کیا، بوڑھیوں نے سر منہ چوم لیا۔ یہ ساری محبتیں حقیقتاً اباجی کے وسیلے سے نصیب ہوئیں۔ شوگر مل میں آج بھی ان کی بات کی جائے تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو شرارتاً ہی ان کے کردار پر انگلی اٹھا سکے۔ دراصل اباجی صراطِ مستقیمی آدمی تھے۔ ایسا بننے کے لئے بڑی کٹھن ریاضت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی صراطِ مستقیمی بننے کی کوشش کرتا ہوں مگر زِگ زیگ چلتا ہوں کیونکہ مجھے احساس رہتا ہے کہ لکیریں اپنے فقیروں کو کھا جاتی ہیں۔

شروع میں اباجی کے ساتھ تعلق میں احترام کے باعث ایک حجاب یا فاصلہ سا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ حجاب کم ہوتا گیا۔ یکسر ختم تو نہیں ہوا مگر ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ضرور ہو گئی کہ انسانی زندگی کے بعض حساس موضوعات پر ہم اطمینان سے گفتگو کر لیتے تھے۔ بعض مسائل میں انہوں نے میری رہنمائی بھی کی۔ میرے مقابلے میں اباجی اپنے پوتوں سے زیادہ بے تکلف تھے۔ زلفی، شازی، ٹیپو تینوں ان کے ساتھ فری تھے۔ اباجی ان کے ساتھ مختلف گیمز کھیلتے، مزے سے ہارتے اور پھر پوتوں کی بے تکلف ہوٹنگ سے لطف اندوز ہوتے۔ پہلے پہل جب میں نے شازی کو ہوٹنگ کرتے دیکھا تو اس کی بدتمیزی کو محسوس کرتے ہوئے اسے سختی سے ڈانٹا مگر اسی وقت اباجی کی جوابی ڈانٹ مجھے پڑی کہ جیسے کرتے ہیں کرنے دو۔۔تو میں نے دادا، پوتوں کی بے تکلفی سے خود کو الگ کر لیا۔

علالت کی حالت میں اباجی بار بار مجھے اور آپی کو یاد کرتے رہے یا پھر ٹیپو، مانو اور انس (چھوٹے پوتوں اور پوتی) کو یاد کرتے رہے۔ آپی نے کراچی میں کوئی خواب دیکھا اور گھبرا کر از خود اباجی کے پاس پہنچ گئی۔ اباجی نے آپی کو گلے سے لگا لیا۔ دیر تک روتے رہے اور پھر کومے کی حالت میں چلے گئے۔ جب میں پہنچا کومے کی حالت میں تھے۔ باقی بہن بھائی بھی جمع ہونے لگے۔ شاہدہ، بے بی، اکبر، طاہر، اعجاز سب آ گئے۔ زبیدہ امریکہ میں تھی اس کا آنا ممکن نہ تھا۔ نوید نے پہنچنے میں تھوڑی دیر کر دی۔۔نوید آ گیا تو پانچوں بیٹے باپ کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سب نے سامنے آ کر اپنا نام لیا۔ ہر

آواز پر ابا جی نے آنکھیں کھولیں اور ان کی آنکھوں میں غروب ہوتے ہوئے زندگی کے سورج نے ہر بیٹے، بیٹی اور عزیز کو خدا حافظ کہا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔

ابا جی کی وفات کے بعد ایک دوست نے تعزیتی خط میں لکھا کہ میں جب بھی خانپور میں قیام کے دنوں میں آپ کے گھر پر دستک دیتا۔ اگر آپ کے ابا جی آتے اور میں ان سے آپ کا پوچھتا تو آپ کا نام سنتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

رحیم یار خاں کے قریب ایک گاؤں ''بستی قندھارا سنگھ'' (یا شاید بستی گندھارا سنگھ) کی ایک فیملی سے ہمارے رشتہ داروں جیسے تعلقات ہیں۔ ابا جی کی وفات کے بعد خالہ فاطمہ وہاں سے تعزیت کے لئے آئیں تو انہوں نے بتایا کہ ان کے بھائی شاہ محمد صاحب پورے خاندان سمیت بھارتی پنجاب سے سیدھے اسی گاؤں میں آئے تھے۔ عید سے چند دن پہلے ابا جی کی دکان پر گئے اور انہیں سونے کے کڑے دے کر کہنے لگے کہ اسے گروی رکھ کر ہمیں کپڑا اُدھار دے دیں تا کہ بچوں کی عید ہو جائے۔ ابا جی ان کی پسند کے مطابق کپڑا دیتے چلے گئے۔ جب ان کا مطلوبہ سارا کپڑا دے دیا تو ابا جی نے سیف سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور شاہ محمد صاحب سے کہا یہ میری طرف سے آپ کے بچوں کے لئے عیدی ہے۔ سونے کے کڑے واپس لے جایئے اور کپڑوں کی رقم جب سہولت کے ساتھ دے سکیں، دے جایئے۔۔ کسی شناسائی کے بغیر اس سلوک پر شاہ محمد صاحب پہلے حیران ہوئے پھر آبدیدہ ہو گئے۔ نتیجتاً ان کے خاندان کے افراد سے آج بھی ایسا گہرا تعلق بنا ہوا ہے جو بعض رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ البتہ خالہ فاطمہ کے اس انکشاف کے بعد مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ابا جی کا کپڑے کا اچھا بھلا کاروبار زوال کا شکار کیوں ہوا۔

ابا جی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میّت کو سر سے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا اور پھولوں سمیت ہی دفن کیا تھا۔ وفات کے تیئسویں دن، رات کے نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو ابا جی کا ذاتی کمرہ تھا۔ یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔ میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بھی کمرے میں بلا لیا۔ انہوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں بھی ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آ کر محسوس کیا اور پھر آوازیں دے کر سارے افرادِ خانہ کو جمع کر لیا۔ سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔ چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔ دونوں دفعہ خوشبو کا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہا ہو۔

بابا جی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملے میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمہیں ملتی رہتی۔ شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رونما ہو جاتا۔ مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کر لیا ہے۔ بابا جی کی باتیں بابا جی جانیں۔ لیکن یہ خوشبو کیا تھی؟۔۔ اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے۔

☆☆☆

انشائیہ

یہ خیر و شرّ کے سلسلے

حیدر قریشی

خیر اور شر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں
بھول اور توبہ کرتے سارے سانس بسر ہو جائیں

میرے ایک فلم ساز دوست ص۔پ ہیں۔فلمسازی کے میدان میں دو یادگار فلاپ فلمیں چھوڑنے کے علاوہ انہوں نے تیسری فلم مکمل کر کے ڈبے میں ہی بند کر دی ہے۔اپنی دوسری فلم میں انہوں نے ایک نئی لڑکی بطور ہیروئن کاسٹ کی۔لیکن ابتدائی مرحلے میں ہی اسے دل دے بیٹھے،شادی کی بات طے ہو گئی۔ چنانچہ **انہوں نے کوشش کر کے پوری فلم اسلامی مزاج کے مطابق بنائی۔پوری فلم میں ہیرو کو ہیروئن کے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔بس دور ہی دور سے پیار کی پینگیں بڑھائی گئیں۔ہیروئن کو برقع پہنایا گیا۔رقص میں سر سے دوپٹہ نہیں اُترنے دیا گیا۔فلم فلاپ ہو گئی لیکن فلم ساز اور ہیروئن کی شادی کامیاب رہی۔** خدا کرے آگے بھی کامیاب رہے۔ یہ تعارف تو ضمنی تھا۔ اصل بات مجھے یہ بتانا تھی کہ موصوف بے حد محبت کرنے والے انسان ہیں۔ جس سے محبت کرتے ہیں اسے اعلیٰ قسم کی شراب ضرور پلاتے ہیں۔اکثر احباب محض شراب پینے کے شوق میں جان بوجھ کر اُن کی محبت کا شکار ہوتے ہیں۔میں جب پہلی بار اُن کی محبت کی زد میں آیا تو انہوں نے بڑے خلوص سے اپنے گھر پر مدعو کیا اور بڑی محبت کے ساتھ کوئی مہنگی سی شراب میری تواضع کے لئے پیش کی۔ میں نے سلیقے سے معذرت کر لی اور انہیں بتایا کہ ابھی تک سگریٹ کے لطف سے بھی محروم ہوں۔بس صرف شاعر دِکھنے کے لئے ایک دو تصویریں ایسی ضرور بنوالی ہیں کہ جیسے سگریٹ پی رہا ہوں۔اس وقت تو موصوف نے رسمی حیرت کا اظہار کر کے مجھے چھوڑ دیا مگر میرے لئے ان کی محبت اسی طرح موجزن رہی۔ چند ملاقاتوں کے بعد وہ مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گئے۔ان کی ہیروئن بیگم بھی ساتھ تھیں۔وہاں انہوں نے نے شراب کا آرڈر دے دیا۔میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔فائیو اسٹار ہوٹل کا ماحول، دوست کی محبت کی شدت اور ہیروئن بھابی کا مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا اصرار۔

دل نے متعدد دلائل پیش کرنا شروع کر دیئے۔دیکھو یار! کسی کی محبت اور خلوص کو ٹھکرانا شراب پینے سے بڑا پاپ ہے۔خود کو نیک سمجھنے والے متکبر ہو کر ابلیس قرار پاتے ہیں۔اس مقام سے بچو۔تھوڑی سی شراب پی لو تا کہ خود کو بہت زیادہ نیک پاک نہ سمجھ سکو۔احساسِ گناہ سے طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہو گا اور پھر توبہ کی توفیق ملے گی۔بے شک اللہ تعالیٰ بے حد غفور الرحیم ہے۔ ارے یار! جنت میں بھی تو شراب ملنے کی بشارت ہے۔پتہ نہیں جنت میں داخلہ ملتا ہے یا نہیں۔وہاں داخلہ نہ ہوا تو جہنم میں رہ کر بھی شراب کی لذت سے نا آشنا رہو گے۔لعنت ہے ایسی جہنمی پر!

دل کے دلائل ابھی جاری تھے،لیکن شراب ختم ہو چکی تھی۔اب میرے سامنے خالی جام دھرا تھا۔کوئی نشہ نہیں ہوا۔بعد میں پتہ چلا یہ تو زیٹ تھی جس میں ۰ا فیصد الکوحل ہوتی ہے گویا کوکا کولا سے تھوڑی زیادہ تھی لیکن پھر بھی تھی تو شراب ہی۔ چنانچہ احساسِ گناہ غالب ہونے لگا۔ میری عادت ہے کہ کوئی بات دل پر بوجھ بننے لگے تو بیوی کو ضرور بتا دیتا ہوں چنانچہ میں نے بیوی کو خط لکھ دیا کہ یہاں میں ایک دوست اور اس کی بیوی کا دل رکھنے کے لئے شراب کا ذائقہ چکھ چکا ہوں۔ساتھ ہی اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے مزید واضح کر دیا کہ اس واقعہ سے رنجیدہ یا پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔آخر یورپ پہنچ کر بھی مجھے وائن کا ذائقہ تو چکھنا ہی تھا۔یوں گناہ کا احساس تو کم ہو گیا لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھنے لگا۔گناہ فی ذاتہٖ کیا ہے؟۔پھر اس سوال سے منسلک متعدد ذیلی سوال اور حقیقت واضح ہونے لگی۔

دُنیا میں کوئی فعل فی ذاتہٖ اچھا یا برا نہیں ہے۔کسی فعل کو آپ مکمل خیر یا شر قرار نہیں دے سکتے۔مثلاً مرد اور عورت کے تعلق کا جنسی عمل ایک حقیقت ہے۔ مذہبی یا سماجی نقطۂ نظر سے معاملہ صرف یہ ہے کہ جب یہ تعلق شادی کی کاروائی کے بعد استوار ہوتا ہے تو عین ثواب قرار پاتا ہے اور اگر شادی کے بغیر استوار کر لیا جائے تو قابلِ نفرین!۔کسی انسان کو عام حالات میں قتل کر دیا جائے تو ظلمِ عظیم قرار پاتا ہے لیکن اپنے وطن کی حفاظت کے نام پر جنگوں میں ہزاروں، لاکھوں انسان ہلاک کر دیئے جاتے ہیں اور فخر کیا جاتا ہے۔انسانوں کے قاتلوں کو ان کے کارناموں پر تمغے عنایت کئے جاتے ہیں۔گویا جنسی عمل ہو یا قتل

انسانی۔ اپنی ذات میں کوئی فعل نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ اس کا مذہبی، سماجی یا سیاسی تناظر اسے خیر یا شر کے خانے میں ڈالے گا۔

اگر دنیا کا یہ کارخانہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور اس نے ہر ذرّے میں خواص رکھے ہیں اور ہر ذی روح کو استعداد یں بخشی ہیں تو ہر ذی روح کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو کمال تک پہنچائے۔ **اگر یہ فارمولا طے ہے تو پھر سور کو آپ لاکھ برا بھلا کہہ لیں اس بے چارے نے کرنا وہی کچھ ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ سانپ میں ڈسنے کی استعداد اور بچھو میں ڈنک مارنے کی استعداد بھی تو خدا نے رکھی ہے۔ اگر سانپ کسی کو ڈستا ہے یا بچھو کسی کو ڈنک مارتا ہے تو وہ ان کے لئے خیر ہے کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ شر تو اُن کے لئے ہے جو اُن کا شکار ہو رہے ہیں۔ لہٰذا سُو رہو، سانپ ہو، بچھو ہو یا میرے کرم فرما شیخ صاحب۔** سب اپنے اپنے عمل میں، طور طریقوں میں حق بجانب ہیں۔

جرأت وغیرت اور غنڈہ گردی وظلم میں تفریق کسی فعل کی نوعیت سے نہیں کی جاتی۔ فعل تو ایک ہی ہے۔ اگر ہمارے خلاف سرزد ہو رہا ہے تو غنڈہ گردی اور ظلم ہے اور اگر ہم اس کا ارتکاب کر رہے ہیں تو یہ جرأت اور غیرت ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ ترقی پسندوں نے ادبی مارشل لا نافذ کیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ویسا ہی طرزِ عمل بعض دینی ادب والوں نے بھی اپنا رکھا ہے تو وہ مسکرائے اور بولے بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہم اسے مارشل لا کی جگہ ماشاء اللہ کہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ سچ اور جھوٹ کا ہے۔ بعض لوگ صاف گوئی سے کہتے ہیں کہ دروغِ مصلحت آمیز جائز ہے جبکہ بعض لوگ ہر طرح کے جھوٹ کو جھوٹ قرار دے کر بآوازِ بلند **لعنتہ اللہ علی الکاذبین** پڑھتے ہیں لیکن اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جھوٹ سے لے کر دھوکہ دہی تک سب حربے بھی استعمال کر جاتے ہیں اور پھر بڑی معصومیت کے ساتھ اسے مومنانہ فراست اور حکمت قرار دے دیتے ہیں۔ میرے کرم فرما شیخ صاحب بھی اسی قماش کے مومن ہیں۔ ایک دانشور دوست نے غالباً شیخ صاحب جیسے لوگوں کے لئے ہی کہا تھا کہ باوضو ہو کر گناہ کرتے ہیں اور گناہ کرنے کے بعد بھی باوضو رہتے ہیں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تاروں بھرا آسمان دیکھ کر کہے کہ میں اس وقت آسمان پر موجود اتنے سارے ستارے دیکھ رہا ہوں، تو یہ بات بالکل سچ ہوگی۔ اس کے باوجود اس میں غیر ارادی جھوٹ بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ حقیقتاً جن ستاروں کی روشنی ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہے وہ اس وقت کی نہیں ہزاروں برس پہلے کی ہوتی ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص تیسری دنیا کے بعض مما لک کے غیر انسانی رویوں سے تنگ آ کر مغربی مما لک میں سیاسی پناہ لیتا ہے تو اس کا بیان عموماً ۹۹ فی صد جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا دکھ سچا ہوتا ہے اس لئے اس کے مداوا کے لئے دیا گیا اس کا جھوٹا بیان بھی سچ ہے۔ مکمل سچائی تو صرف خدا تعالیٰ کی ہستی ہے۔ باقی سب جزوی سچائیاں ہیں اس لئے اپنے جزو پر نازاں ہو کر کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسی وقت اس کی اپنی باقی ساری انگلیاں خود اُسی پر اٹھی ہوتی ہیں۔

تمام چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ سردی اور گرمی۔ بہار اور خزاں۔ دن اور رات۔ علم ریاضی کا سارا نظام جمع اور نفی پر قائم ہے۔ بجلی میں مثبت اور منفی مل کر کرنٹ پیدا کرتے ہیں۔ تمام جانداروں میں نر اور مادہ مل کر زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔ زرتشت مسلک میں دو خداؤں کا تصور ہے۔ یزداں، خیر کا خدا۔ اور اہرمن، شر کا خدا۔ دونوں کے درمیان ازل سے مقابلہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ خیر اور شر کی دو بڑی قوتوں کا تصور کسی نہ کسی رنگ میں ہر مذہب میں موجود ہے۔ خیر اور شر کی اسی آویزش اور آمیزش سے ہی تو کائنات رنگ برنگی لگتی ہے۔ یہ خیر وشر کے سلسلے کتنے خوبصورت ہیں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہیگل کی جدلیات کا جادو کتنا طاقتور ہے جو آج بھی ساری کائنات کے سر چڑھ کر بول رہا ہے!

☆☆☆